دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۱۱۰	ربیع الثانی - جمادی الاوّل ۱۴۴۸ھ مطابق اکتوبر ۲۰۲۶ء	شمارہ: ۱۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
https://darululoom-deoband.com/urdumagazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 110, Issue No. 10, October. 2026 अक्तूबर 2026
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 50/=	Annual Subscription Rs. 500/=

Annual by Regd Post. Rs. 700/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۲۱۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۸۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۸۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرف آغاز	مدارس اسلامیہ کی خدمت میں دو باتیں	محمد سلمان بجنوری	۳
فقہی رہنمائی	طلاق وخلع کے اسباب اور اُن کا حل	قاضی محمد فیاض عالم قاسمی	۶
اسلامی تاریخ	عہد عثمانی اسلامی تاریخ کا زریں باب	مولانا غلام اکبر لاشاری	۱۴
دفاع صحابہ	حضرت خالد بن ولیدؓ کی پگڑی کا اُتارا جانا	مفتی محمد فیاض قاسمی	۲۰
//	حضرت معاویہؓ پر ایک سنگین الزام اور اس کی حقیقت	مولانا یحییٰ نعمانی	۲۷
فکری رہنمائی	علم وقلم اور امت کی فکری تعمیر	ڈاکٹر مفتی سہیل ندوی	۳۶
//	جدید انسان کا المیہ	مولانا محمد اسلام حقانی	۴۶
	نئی کتابیں	ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی	۵۰
	//	مولانا محمد رافع ندوی	۵۵

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/700 روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

حرف آغاز

مدارس اسلامیہ کی خدمت میں دو باتیں

محمد سلمان بجنوری

دینی تعلیم کا جو نظام مدارس اسلامیہ کی شکل میں چل رہا ہے اور جس کا مرکزی اور نمائندہ ادارہ دارالعلوم دیوبند ہے، اس وقت یہ نظام اپنی تاریخ کے جس نازک دور سے گزر رہا ہے، اس سے سبھی واقف ہیں، صورت حال ایسی بن گئی ہے کہ مدارس کا ظاہری ڈھانچہ (یعنی عمارات وغیرہ) اور معنوی ڈھانچہ (یعنی نصاب ونظام) دونوں ہی خطرات کی زد میں ہیں، ظاہری ڈھانچہ کو جو خطرات درپیش ہیں وہ بھی دراصل معنوی وجود کو نشانہ بنانے کے لیے کھڑے کیے گئے ہیں، یعنی اگر آپ مدارس کی عمارات کو دنیا کے پسندیدہ نظام تعلیم کے لیے استعمال کرنے کو تیار ہیں، تو آپ کی عمارات محفوظ رہ سکتی ہیں، وہ بھی اُن کی مقرر کردہ حدود وشرائط کے ساتھ؛ لیکن اگر آپ کو مدارس کا اصلی وجود اور کردار محفوظ رکھنے پر اصرار ہے تو پھر ظاہری وجود بھی شدید خطرات سے دوچار ہے۔

ایسے حالات میں مدارس اسلامیہ کو ایک طرف تو، مدارس کے ظاہری وجود اور اُن کی عمارات وغیرہ کے تحفظ کے لیے نہایت سنجیدہ اور دوراندیشانہ اقدامات کرنے ہوں گے، جن میں تعمیراتی قوانین وضوابط کی پابندی، تمام جائیدادوں اور املاک کے قانونی تحفظ کا انتظام اور وہ ساری کارروائیاں شامل ہیں جن سے تمام حکومتی شعبوں (مثلاً حقوق اطفال وغیرہ) کے مطالبات کی تکمیل ہوجائے اور اس کی آڑ میں نشانہ بنائے جانے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں ان تمام مشوروں اور ہدایات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے جو دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران عرصۂ دراز سے ''رابطہ مدارس'' کے پلیٹ فارم سے دیتے رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر ان مشوروں کو بروقت عملی طور پر نافذ کرلیا جاتا تو آج بہت سے ضابطوں کے حوالے سے جو مسائل کھڑے ہورہے ہیں ان میں سے اکثر نہ پیش آتے اور مدارس کی عمارات وغیرہ کے لیے موجودہ حالات وجود میں نہ آتے۔

لیکن اس کے ساتھ اور اس سے بڑھ کر مدارس کے حقیقی کردار اور معنوی وجود کے تحفظ کے لیے

کام کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ اس لیے کہ مدارس کے خلاف منفی ذہن سازی اور مخالفانہ پروپیگنڈہ مسلسل جاری ہے، یہ پروپیگنڈہ کتنا طاقت ور، ہمہ گیر اور منصوبہ بند ہے، اس کا اندازہ بھی اکثر اہل مدارس کو نہیں ہے۔ اگر آپ گزشتہ پچیس سال (نائن الیون کے واقعہ کے مابعد) کے واقعات وحالات پر نظر رکھتے ہیں تو شاید آپ اس کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

نائن الیون کا واقعہ جس کے بعد، ہر سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑنا ایک عام فیشن بن گیا ہے، اس واقعہ کے نتائج کھلے طور پر اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ واقعہ چند پرجوش سرپھرے مسلم نوجوانوں کا کام نہیں تھا؛ بلکہ عالمی طاقتوں کے مسلسل منصوبوں کا ایک خطرناک حصہ تھا جس کے بعد تمام مسلم علامتوں کو دہشت گردی کا ذمہ دار بنادیا گیا اور اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ جب جس کا جی چاہے اسلامی مدارس کو بغیر کسی تکلف کے، دہشت گردی کا اڈا کہہ دے پھر اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ہمارے ملک میں مدارس کے نصاب کا تجزیہ کر کے بہت سے شرعی احکام واصطلاحات کو دہشت گردانہ ذہن کی بنیاد کہا جانے لگا۔ اس سے پہلے مدارس کی برأت کے لیے یہ بات ہم لوگ کہہ سکتے تھے کہ مدارس تو مذہبی تعلیم کے مراکز ہیں اور قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے ہیں، اس بات سے عام ذہن مطمئن ہوجاتا تھا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ وہ بہت سی قرآنی آیات اور متعدد احادیث کے حوالے سے مدارس کے نصاب اور اس سے پیدا ہونے والے ذہن کو پرتشدد اور دہشت گردانہ قرار دینے پر آمادہ ہیں۔

پھر اس پروپیگنڈے کے اثرات پر اگر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ، خود کلمہ گو مسلمانوں کے ایک ذہن کو بھی مدارس کے خلاف کھڑا کردیا ہے۔ غیروں کے یہاں تو اس معاملہ میں مسلمانوں اور مدارس کی شبیہ آخری حد تک بگاڑی جاچکی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دہشت گردانہ ذہن کی ترجمانی کے لیے دین دار مسلمانوں اور علماء کرام کی تصاویر تک استعمال کر لیتے ہیں، خود مسلمانوں میں اس پروپیگنڈے کے اثرات بہت گہرے ہوتے جارہے ہیں، یہ بات تو پہلے سے معلوم ہے کہ جدت پسند مسلمانوں کا بڑا طبقہ مدارس سے کبھی بھی مانوس نہیں رہا ہے؛ لیکن اب ان کے علاوہ بھی بہت سے مسلمان مدارس سے ذہنی طور پر دور ہورہے ہیں، ایک بڑی تعداد مدارس کی ضرورت وافادیت ہی کی منکر ہے۔ اس کی نظر میں مدارس، بے ضرورت ہیں، امت پر بوجھ ہیں، امت کی ترقی میں رکاوٹ ہیں اور اپنے کردار میں کسی مثالی نمونے کے حامل نہیں ہیں اور بعض لوگ تو بالکل دشمنوں والے ذہن اور تعبیرات کے حامی ہیں۔

ان سب باتوں کے ساتھ ایک پہلو اور ہے جس پر توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ مخالف ذہن ہر جگہ، جھوٹے پروپیگنڈے کا نتیجہ نہیں ہے، کچھ واقعی غلطیاں بھی ہیں جن سے مدارس کے خلاف ذہن تیار ہوتا ہے۔ ان غلطیوں کا تعلق بنیادی طور پر مدارس کے اندرونی نظام سے ہے، خواہ وہ مالی نظام کی کمزوریاں ہوں یا تربیت کے پہلو سے سامنے آنے والی کوتاہیاں، ان سب کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اس پوری صورت حال کا تقاضا ہے کہ مدارس، ہر منفی ذہن اور پروپیگنڈے کے لیے نہایت سنجیدہ، مثبت اور ٹھوس اقدامات کریں، ان اقدمات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) **اصلاحی اقدامات**: یعنی مدارس میں پائی جانے والی ہر کمزوری پر قابو پانے کی کوشش، خواہ وہ سرکاری اور ملکی قوانین کے تعلق سے ہو یا اپنے تعلیمی تربیتی اور مالی نظام سے متعلق ہو، اس کام کے لیے اپنے اندر احتساب کی کیفیت پیدا کرنا ہوگی۔ مدارس کو ذاتی اختیار سے نکال کر اصولی، شرعی اور شورائی مزاج پر لانا ہوگا اور حضرات اکابر رحمہم اللہ کے ذوق ومزاج پر کام کرنا ہوگا۔

(۲) **دفاعی اقدامات**: اس کے لیے ہر قسم کے مخالف ذہن کو سامنے رکھ کر، ہر پہلو سے حسب ضرورت اور حسب موقع وضاحت کرنے اور جواب دینے کا اہتمام کرنا ہوگا اور اجتماعی مشورے سے منفی پروپیگنڈوں کے توڑ کے لیے مؤثر قدم اٹھانا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے اکابرؒ کے برپا کردہ اس نظام کو بھرپور استحکام عطا فرمائے اور ہمیں اپنی ذمہ داریوں کے تئیں حقیقی سنجیدگی اور اخلاص نیت کی توفیق سے نوازے۔ آمین!

* * *

طلاق وخلع کے اسباب اوران کا حل

از: قاضی محمد فیاض عالم قاسمی
ناگپاڑہ، ممبئی

نکاح انسانی زندگی کا ایک نہایت اہم اور پاکیزہ رشتہ ہے۔ اسلام نے اسے محض دو افراد کے باہمی تعلق کا نام نہیں دیا؛ بلکہ خاندان، نسل، اخلاق اور معاشرتی استحکام کی بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآن مجید نے ازدواجی زندگی کا مقصد سکون، محبت اور رحمت بیان کیا ہے۔ ایک کامیاب گھر وہ ہے جہاں میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے سکون کا ذریعہ بنیں، ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، مشکلات میں ساتھ دیں اور اولاد کی اچھی تربیت کریں؛ لیکن جب یہی رشتہ اختلاف، بداعتمادی، ظلم، غصے اور مسلسل کشمکش کا شکار ہوجائے تو گھر کا سکون ختم ہوجاتا ہے اور بالآخر طلاق یا خلع کی نوبت آجاتی ہے۔ طلاق اور خلع اگرچہ اسلام میں جائز ہیں؛ لیکن انھیں معمولی اختلافات کا فوری حل سمجھنا درست نہیں۔ ہمیں ان کے اسباب پر باریک بینی اور سنجیدگی سے غور کرکے حل تلاش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ عام طور پر لوگ طلاق کے اسباب میں مرد کی جہالت اور عدم برداشت کو بیان کرتے ہیں؛ لیکن مشاہدہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں طلاق سے زیادہ خلع ہوتے ہیں، یعنی عورت کے مطالبہ پر علیحدگی ہوتی ہے۔ بہرحال طلاق ہو یا خلع ذیل میں دس اسباب بیان کیے جاتے ہیں جو ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہیں۔

۱- نکاح سے پہلے مناسب تیاری نہ ہونا

طلاق وخلع کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم شادی کے لیے مادی تیاری تو کرتے ہیں؛ لیکن ازدواجی زندگی کیسے گزاری جائے اس کی تیاری نہیں کرتے ہیں۔ شادی کے لیے لباس، زیورات، دعوت، ہال، کھانے اور دیگر انتظامات پر بہت وقت اور پیسہ صرف کیا جاتا ہے؛ مگر لڑکے اور لڑکی کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ شادی کے بعد عملی زندگی کس طرح چلانی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے نصابِ تعلیم میں یہ مضمون بھی نہیں ہے اور نہ ہی لیکچر کا کوئی نظم کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ انسان اپنی زندگی کا دو تہائی

حصہ شوہر یا بیوی کی صورت میں گزارتا ہے۔نوجوانوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ شادی صرف محبت اور جذبات کا نام نہیں، شادی کوئی عارضی لطف اندوزی (منورنجن) کا نام نہیں؛ بلکہ اس میں ذمہ داری، قربانی، برداشت، مالی تعاون، باہمی احترام اور مشکلات میں ثابت قدمی ضروری ہے۔ایک انسان جب دوسرے کو اپنا شریکِ حیات بناتے ہوئے کہتا ہے کہ ''میں نے قبول کیا'' تو گویا کہ انھوں نے بہت ساری چیزوں کو بھی ساتھ میں قبول کیا، اگر مرد ہے تو بیوی کے ناز ونخرے کو بھی قبول کیا اور اگر عورت ہے تو شوہر کی نگہبانی میں اپنی زندگی گزارنے کو بھی قبول کیا۔ایک دوسرے کی اچھی صفات کو قبول کیا اور بری صفات وعادات کو بھی نظر انداز کرنا قبول کیا؛ اس لیے نکاح سے پہلے نوجوانوں کے لیے باقاعدہ تربیتی نشستیں ہونی چاہئیں، جن میں شوہر اور بیوی کے حقوق، مالی معاملات، نفقہ اور زچگی کے اخراجات، شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری کے حدود۔اختلافات کو حل کرنے کے طریقے، بچوں کی تربیت اور خاندان کے ساتھ تعلقات جیسے موضوعات پر شرعی اور قانونی طور پر گفتگو ہو۔

۲- کثرتِ توقعات

ازدواجی زندگی میں بہت سے مسائل اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب میاں یا بیوی اپنے شریکِ حیات سے حد سے زیادہ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔عورت کو ایسا شوہر چاہیے جو ہر وقت رومانوی ہو، بہت زیادہ کمائے، ہر خواہش پوری کرے، زیادہ سے زیادہ شاپنگ کرائے، دنیا بھر میں ان کو لے کر گھومتا رہے اور کبھی اختلاف بھی نہ کرے اور نہ کوئی پوچھ تاچھ، دوسری طرف شوہر کو توقع ہوتی ہے کہ اس کی بیوی ہر معاملے میں اس کی مرضی کے مطابق چلے، اس کی خدمت میں لگا رہے، سارے گھریلو کام کاج کرے، اسے اچھا کھانا بنا بنا کر کھلاتی رہے، شوہر کے ماں باپ اور اس کے بھائی بہنوں کی بھی خوب خوب خدمت کرے، کبھی اختلاف نہ کرے اور ہر ذمہ داری خاموشی سے ادا کرتی رہے۔

حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ہر ایک کی اپنی خواہش ہوتی ہے، اور کوئی ضروری نہیں کہ ہر خواہش پوری ہو جائے، یہ بھی ضروری نہیں کہ دوسرا آپ کی ہر خواہش پوری کرے، شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری کا حکم بھی ایک حد تک ہے، بیوی کے اخراجات شوہر پر لازم ہیں؛ لیکن وہ بھی ایک حد تک ہے، سارے حقوق اور ذمہ داریوں کی حد بندی ہے۔جب آدمی اپنے حدود سے آگے کی سوچتا ہے، خواہش رکھتا ہے، دوسرے سے امید رکھتا ہے، تو پریشانیاں شروع ہونے لگتی ہیں۔اسلام نے حقوق اور فرائض کو باہم مربوط کیا ہے۔ایک کامیاب گھر وہ ہے جہاں ہر فرد صرف یہ نہ سوچے کہ مجھے میرا حق مل رہا ہے یا نہیں؛ بلکہ یہ سوچے کہ میں نے اپنی شرعی، قانونی اور اخلاقی ذمہ داری نبھائی یا نہیں۔

۳-غصہ اور عدمِ برداشت

آج طلاق اور خلع کے اہم اسباب میں غصہ، جلد بازی اور برداشت نہ کرنا ہے۔ بعض اوقات معمولی اختلاف ایک بڑے جھگڑے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ پھر سخت الفاظ استعمال ہوتے ہیں، خاندانوں کو شامل کیا جاتا ہے، ماں باپ کے خلاف باتیں ہونے لگتی ہیں اور ایک دوسرے کی عزت مجروح کی جاتی ہے۔ پھر دونوں کے گھر والے جانبدار ہوکر معاملہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے معاملہ سلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جاتا ہے۔ غصے کے وقت انسان اکثر ایسے الفاظ کہہ دیتا ہے جنہیں بعد میں واپس لینا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے اسلام نے غصے پر قابو پانے، معاف کرنے اور صبر کی تعلیم دی ہے۔ اگر میاں بیوی اختلاف کے وقت فوراً فیصلہ کرنے کے بجائے کچھ دیر خاموش رہیں، حالات کو ٹھنڈا کریں اور پھر بات کریں تو بہت سے مسائل ختم ہوسکتے ہیں۔

۴-سوشل میڈیا کا بڑھتا ہوا اثر

موجودہ دور میں سوشل میڈیا نے ازدواجی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے۔ سوشل میڈیا پر غیرضروری چیٹنگ، خفیہ تعلقات، جذباتی وابستگیاں اور ازدواجی زندگی کی نجی باتوں کو عوامی بنانا بھی اعتماد کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ سوشل میڈیا میں لگے رہنا، یوٹیوب اور فیس بک میں شارٹ کلپس اور رِیلس کو یکے بعد دیگرے دیکھتے رہنا، دوسروں کی اسٹیٹس سے دلچسپی رکھنا، اشارۃً کنایۃً ایک دوسرے کے خلاف اسٹیٹس لگانا، میاں بیوی کے خلاف مزاحیہ کلپس کو ایک دوسرے کو شیئر کرنا، سیریل دیکھتے رہنا، میاں بیوی کے درمیان قائم اعتماد اور پیار و محبت میں دراڑیں پیدا کرتے ہیں؛ حالاں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان اعتماد ہی خوشگوار زندگی کا بنیادی ستون ہے۔ جب یہی ختم ہوجائے تو گھر کا سکون متاثر ہوتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ میاں بیوی سوشل میڈیا کے استعمال میں حدود مقرر کریں، کسی بھی اجنبی سے غیرضروری بات نہ کریں، ایک دوسرے سے شفاف رہیں اور اپنی نجی زندگی کو دوسروں کے سامنے نمائش نہ بنائیں۔ دوسروں کے اسٹیٹس نہ دیکھیں، نہ رِپلائی کریں، اور نہ خود ایک دوسرے کے خلاف اسٹیٹس لگائیں۔

۵-اہل خاندان کی غیرضروری مداخلت

میاں بیوی کے درمیان بعض اختلافات دراصل ان دونوں کے نہیں ہوتے؛ بلکہ خاندانوں کی مداخلت سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض عورتیں ہر چھوٹی موٹی بات اپنے میکہ میں پہونچاتی ہیں۔ گھنٹوں فون پر بات کرتی ہیں، اگر وہ باتیں اپنے میکہ میں نہ بھی پہونچائے تو بھی گھنٹوں بات کرنے کی وجہ

سے سسرال والوں کو شک ہونے لگتا ہے۔اسی طرح بعض دفعہ شوہر ہر بات کے لیے اپنے ماں باپ سے مشورہ کرتا ہے، جس سے بیوی کو یوں محسوس ہوتا ہے میرا خاوند خودمختار نہیں ہیں۔اپنے ماں باپ کے دباؤ میں کام کرتے ہیں۔ہاں اہم اور ضروری کاموں میں ضرور مشورہ کرنا چاہیے اور اس مشورہ میں بیوی کو بھی شامل رکھنا چاہیے۔بہرحال شوہر اور بیوی کا ہر چھوٹا اختلاف والدین تک پہنچانا، ہر معاملے میں خاندان کو فریق بنانا اور ایک دوسرے کے خلاف شکایات کرنا مسئلے کو بڑھا دیتا ہے۔ دونوں کے لیے دونوں کے والدین کا احترام ضروری ہے؛ لیکن ازدواجی زندگی کے ہر فیصلے میں غیر ضروری مداخلت مناسب نہیں۔خاندان کا کردار اصلاح اور مدد کا ہونا چاہیے، نہ کہ میاں بیوی کے درمیان مستقل فریق بننے کا۔

۶-مال ودولت کی کمی یا فراوانی

پیسہ کی ضرورت ہر ایک کو ہوتی ہے؛ لیکن جب پیسہ کم ہو یا بہت زیادہ ہو تو بھی بعض دفعہ ازدواجی زندگی کا ایک بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔بعض نالائق مرد محنت کرنا ہی نہیں چاہتا، نہایت ہی سستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ایک دن کام کرتا ہے تو دو دن آرام کرتا ہے، کسی کمپنی میں کام کرتا ہے تو چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے ناغہ کرتا ہے، بالآخر اس کو نکال دیا جاتا ہے، چند دن بیٹھ کر کھاتا ہے، جب جمع پونجی ختم ہوجاتی ہے تو پھر کام کرنا شروع کرتا ہے؛ لیکن چند دنوں کے بعد پھر سستی کرنا شروع کردیتا ہے؛ لیکن تھوڑی بہت رقم جمع ہوئی تو کام ہی چھوڑ دیتا ہے۔بعض مرد اچھا خاصہ کماتا ہے؛ لیکن نشہ اور غلط عادتوں میں پیسہ ضائع کردیتا ہے۔ظاہر ہے کہ ان وجوہات کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہوگا، اور نوبت طلاق یا خلع تک آئے گی۔

آمدنی کم ہو، اخراجات زیادہ ہوں، تو بیوی خواہی نا خواہی دوسروں سے، بعض دفعہ شوہر سے کہہ کر اور بعض دفعہ ان سے چھپا کر قرض لیتی ہے۔بعض دفعہ شوہر اپنے رشتہ داروں اور دوست واحباب سے نیز اپنے سسرالی رشتہ داروں سے قرض لیتا ہے، جب قرض بڑھ جاتا ہے تو دونوں میاں بیوی کو تکلیف اور پریشانی ہونے لگتی ہے۔شوہر اور بیوی مالی معاملات میں ایک دوسرے سے مشورہ نہ کریں تو گھر میں تناؤ پیدا ہوسکتا ہے۔بعض اوقات شوہر اپنی آمدنی اور اخراجات بیوی سے چھپاتا ہے اور بعض اوقات بیوی غیر ضروری اخراجات کرتی ہے۔نتیجتاً اعتماد کم سے کم تر ہونے لگتا ہے۔

اسی طرح جب آمدنی زیادہ ہو اور ضروری اخراجات کم، تو فضول خرچی، روز روز کی شاپنگ، مہنگے کپڑے، جوتے، اور موبائل کے علاوہ سونے چاندی کے زیورات سے بیوی کو خوش کرنے کی

کوشش کی جاتی ہے، اسی پر بس نہیں؛ بلکہ فلاں پراپرٹی بیوی کے نام، فلاں دکان بیوی کے نام، فلاں فلاں بینک میں بیوی کے نام اتنا بینک بیلنس۔ بعض دفعہ بیوی بھی اصرار؛ بلکہ شوہر کو مجبور کرتی ہے کہ ایسا کریں ویسا کریں، اس موڑ پر آکر بیوی کی نیت خراب ہوجاتی ہے، وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ یہ سب کچھ میرا ہی ہے تو اب مجھے شوہر کی ماتحتی میں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسی طرح جب پیسہ زیادہ ہوتو بعض مردوں کی دوستی یاری غیرمحرم لڑکیوں سے ہونے لگتی ہے، جس سے دونوں میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہونے لگتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ شادی کے بعد میاں بیوی مل کر بجٹ بنائیں، ضروری اور غیرضروری اخراجات میں فرق کریں، قرض سے حتی الامکان بچیں خاص طور پر سسرالی رشتہ داروں سے ہرگز قرض نہ لیں اور مالی معاملات میں دیانت داری اختیار کریں۔

مالی فراوانی کی بنا پر گھر ٹوٹنے کی یہ شکل بھی کثرت سے پیش آرہی ہے کہ شوہر دوبئ، کویت، سعودی عرب میں محنت مزدوری کرکے بیوی کو پیسہ بھیجتا رہتا ہے، بیوی یہاں اپنے نام سے پراپرٹی خریدتی ہے، زیورات بناتی ہے، بینک کھاتے میں اپنے ہی نام پر پیسہ جمع کرتی ہے، شوہر دو تین سال کے بعد چند دنوں کے لیے مہمان کے طور پر آتا ہے اور ان چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، پھر دو تین سال کے لیے چلا جاتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب دو دو سال تک شوہر اپنی بیوی کی صنفی ضرورت کو ادا نہیں کرے گا، اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے نہیں جائے گا، اس کو کہیں گھمانے کے لیے نہیں لے جائے گا، تو یقیناً عورت کے اندر بے وفائی کے جذبات ابھرنے لگیں گے، پھر وہ پیٹھ پیچھے وہ سب کرے گی جو ایک عورت کو اپنے شوہر سے امید ہوتی ہے۔ ایسے واقعات بھی ہمارے مشاہدے میں آئے ہیں کہ جب تین چار سال کے بعد شوہر نامدار گھر آیا تو بیوی نے اس کو پہچاننے سے ہی انکار کردیا، گھر میں گھسنے تک نہیں دیا، مرد نے زور زبردستی کی تو اس پر کیس کردیا کہ کوئی اجنبی میرے گھر میں گھس رہا ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ سب کچھ بیوی کو نہ دیں اور نہ ان کے نام پر خریدیں، اکثر مال ودولت، دکان، مکان، پراپرٹی وغیرہ اپنے ہی نام پر رکھیں، چاہے اس کے لیے آپ کو لمبا اور مہنگا سفر کرنا پڑے۔ اگر بیوی کے نام پر رکھنا ضروری ہے تو کچھ ہی رکھیں۔ دوسری طرف بیوی کو بھی سمجھنا چاہیے کہ جس شوہر نے اس کی خاطر ماں باپ کی شفقت سے دور ہوا، خوشگوار زندگی کی خاطر محنت ومشقت کو برداشت کیا، اس کے ساتھ بے وفائی نہ کرے، کیوں کہ بے وفائی کی سزا آخرت میں تو ملنی ہی ہے، دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔

۷-گھریلوتشدد

طلاق وخلع کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے گھریلو تشدد کا ذکر انتہائی ضروری ہے۔ذہنی اذیت،جسمانی تشدد،مسلسل گالی گلوچ،لعن طعن،تحقیرآمیز جملے،دھمکیاں،مالی استحصال کسی بھی صحت مند خاندان کے لیے تباہ کن ہیں۔عام طور پرخیال یہ کیا جاتا ہے کہ اس طرح کا تشددصرف مرد کرتا ہے، یہ خیال درست نہیں ہے۔تشدد جس طرح مرد کی طرف سے عورت پر ہوتا ہے،اسی طرح عورت کی طرف سے مرد پر بھی ہوتا ہے۔آج کل عورتوں کے تحفظ اوران کوانصاف دلانے کے لیے مختلف ادارے مختلف ناموں سے قائم ہیں،جیسے مہیلا منڈل،''شی ٹیم'' وغیرہ۔خاص عورتوں کی سیفٹی کے لیے پولس کی گاڑیاں بھی چکر لگاتی ہیں۔حکومت کی طرف سے ٹول فری نمبرات بھی لانچ کیے گئے ہیں جن پر کال کرنے سے فوراً پولس اہلکار حاضر ہوجاتے ہیں؛لیکن خاص مردوں کی حفاظت کے لیے نہ کوئی پُرش منڈل ہے اورنہ''ہی ٹیم''، یا کوئی ٹول فری نمبر ہے۔اسلام کسی بھی انسان کوظلم کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے، اورنہ ہی ظلم سہنے کا حکم دیتا ہے؛اس لیے ہر اختلاف کو''صبر کرو اور برداشت کرو'' کہہ کرختم کردینا درست نہیں۔اگر کسی عورت یا مرد کوحقیقی خطرہ ہوتو اس کی حفاظت اورمناسب مداوالین ترجیح ہونی چاہیے۔حکومت اورتنظیموں کواس طرف بھی دھیان دینا چاہیے۔

۸-محبت اور گفتگو کی کمی

بہت سے گھرانے اس لیے بھی ٹوٹ جاتے ہیں کہ میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں؛لیکن ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے، یابات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا ہے،مردسویرے گھر سے نکلتا ہے، کام کاج کرکے دیررات گھر پہونچتا ہے، جب تک یا تو بیوی سوچکی ہوتی ہے، یا سونے کا وقت ہوجاتا ہے،شوہر کومعلوم نہیں ہوتا کہ بیوی کس ذہنی دباؤ سے گزر رہی ہے،اور بیوی کومعلوم نہیں ہوتا کہ شوہر کن معاشی یا پیشہ ورانہ مشکلات کا سامنا کررہا ہے؛اس لیے دونوں ذہنی دباؤ میں رہتے ہیں، اورنوبت علیحدگی تک آجاتی ہے۔اس کا حل یہ ہے کہ پیار ومحبت کے علاوہ گھر کے اخراجات، بچوں کی تعلیم، ملازمت اورروزمرہ کاموں پر بھی بیوی کے ساتھ گفتگو ہونی چاہیے۔روزانہ کچھ وقت صرف ایک دوسرے کے لیے نکالنا ازدواجی زندگی کومضبوط بنانے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

۹-جہالت اور تعلیم

جہالت اورتعلیم دونوں طلاق وخلع کے اسباب میں سے ہیں۔عام طور پرلوگ خیال کرتے ہیں کہ جہالت یا نادانی کی وجہ سے طلاق یاخلع کی نوبت آگئی، حالاں زیادہ پڑھالکھا ہونا بھی طلاق

اورخلع کے اسباب میں سے ایک ہے۔ ہمارے پاس دسیوں ایسے معاملات آئے کہ میاں بیوی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، دونوں نوکری کرتے ہیں، لاکھوں روپے کماتے ہیں؛ لیکن گھر میں سکون نہیں ہے۔ بیوی نہ شوہر کی بات مانتی ہے اور نہ شوہر بیوی سے مشورہ کرتا ہے، دونوں اپنے اپنے کاموں میں دن بھر مصروف رہتے ہیں، اور جب تھکا ہارا رات میں گھر آتے ہیں تو آرام کے علاوہ دو میٹھے بول بھی نہیں بول پاتے ہیں۔اس کا حل یہ ہے کہ اپنے کام کاج کو مختصر کیا جائے، اپنی زندگی سے بھی لطف اٹھایا جائے۔اچھے کھانے پینے، سیر وتفریح کرنے اور بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزارنا بھی شریعت کی تعلیمات میں سے ہیں۔

جہاں تک رہی بات جہالت کی یقیناً یہ بھی ایک سبب ہے، حقوق اور ذمہ داریوں سے ناواقفیت اور طلاق کے مسائل سے لاعلمی؛ بلکہ اس سے بڑھ صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے طلاق خلع کی نوبت آتی ہے۔

۱۰- بیماری:

صحتمند انسان اپنی محنت اور جستجو سے ہر میدان میں کامیاب ہوجاتا ہے؛ لیکن بیمار انسان چاہتے ہوئے بھی اکثر اوقات ناکام ہوتا ہے۔ لاک ڈاؤن کے بعد ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں بالخصوص مائیگرین، ڈپریشن، انگزائیٹی، بائی پولرڈس آرڈر، بورڈلائن پرسنالیٹی ڈِس آرڈر، بلڈ پریشر، شوگر وغیرہ جیسی بیماریوں میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ان بیماریوں میں انسان کو جلدی غصہ آجاتا ہے، چھوٹی سی بات کو بہت بڑا مسئلہ سمجھ لیتا ہے۔اس کو دوسروں سے قدم قدم پر بدگمانی ہونے لگتی ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بیماریوں کا اثر میاں بیوی کی زندگی میں بھی پڑتا ہے، پھر دھیرے دھیرے طلاق یا خلع تک کی نوبت آجاتی ہے۔اس کا حل یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت محسوس ہو تو علاج کرایا جائے۔خوارک اور نیند اچھی لے، ساتھ ہی شریعت کے احکام کی پابندی کرے، فرائض کے ساتھ سنن ومستحبات کی رعایت کرے، مراقبہ کرے، صبح وشام تھوڑی دیر چہل قدمی بھی کرے۔

اسلامی تعلیمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ازدواجی اختلاف پیدا ہوتے ہی طلاق یا خلع کی طرف نہیں جانا چاہیے۔سب سے پہلے گفت وشنید ہو پھر نصیحت اور اصلاح کی کوشش ہو۔ضرورت ہو تو خاندان کے سمجھ دار افراد کو شامل کیا جائے۔قرآن مجید نے شدید اختلاف کی صورت میں دونوں خاندانوں سے ایک ایک حکم مقرر کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔اگر دونوں اصلاح چاہیں تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کرسکتا ہے۔یہ اصول آج بھی نہایت اہم ہے۔

مسئلہ طلاق وخلع کا پائدار حل یہ ہے کہ:

۱- ازدواجی حقوق وذمہ داری سے متعلق امور پر نصاب مقرر کیا جائے، جس میں قانونی اور شرعی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہو۔

۲- اس نصاب کو مدارس، اسکول اور کالج کی تعلیم میں ایک مضمون کے طور پر شامل کیا جائے۔ جہاں تک اس حقیر کا خیال ہے کہ گیارہویں اور بارہویں میں یہ مضمون شامل ہونا چاہیے۔

۳- مساجد، ومدارس، مسلم تنظیموں اور سماجی اداروں کو ایسے شعبہ قائم کرنا چاہیے جس میں شادی سے قبل اور بعد میں نوجوانوں کی تربیت دی جاسکے۔

۴- اس کے لیے ایسے تربیت یافتہ میریج کاؤنسلر اور خاندانی مشیروں کا نظم کرے۔ جس میں مذہبی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی ماہرین شامل ہوں۔

۵- یہ مشیر حضرات ہر نوجوان کو تربیت دیں، اور انھیں میاں بیوی کے رشتہ ازدوارج سے متعلق امور کی تربیت کریں۔ فقط واللّٰہ الموفق وھو المستعان.

* * *

عہدِ عثمانی اسلامی تاریخ کا زریں باب

از: غلام اکبر لاشاری
فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

دورِ خلافت راشدہ تاریخِ اسلامی کا ایسا تابناک دور تھا کہ عالمی طاقتیں پرچمِ اسلام کے سامنے سرنگوں تھیں۔ اور لوگ متاثر ہو کر جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ خلفاء راشدین نے اعلاء کلمۃ اللہ اور عوامی فلاح و بہبود کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا۔ خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بارہ سالہ دورِ خلافت اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی درخشاں، زریں اور فتوحات و انتظامی ترقی سے بھرپور دور تھا۔ آپ نے اپنے عہدِ مبارک میں اسلامی مملکت کی سرحدوں کو دور دراز کے علاقوں تک پھیلا کر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ آپ کے دورِ خلافت میں ویسے تو تمام ملکی، سیاسی اور معاشی انتظامات انتہائی بہترین اور مثالی طریقے سے چلائے جا رہے تھے، تاہم چند انقلابی اقدامات، انتظامی اصلاحات اور فتوحات ایسی تھیں جنہوں نے تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے۔ آپ کے عظیم کارناموں میں سب سے نمایاں کارنامہ قرآن مجید کو ایک معیاری لہجے پر جمع کرنا اور اس کے نسخے تمام قلمرو میں پھیلانا تھا، جس کی بدولت آپ کو ''جامع القرآن'' کا معزز لقب ملا۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اسلامی تاریخ کا پہلا باقاعدہ بحری بیڑا تیار کروایا جس نے مسلمانوں کو سمندری راستوں پر بھی ناقابلِ شکست بنا دیا۔ آپ نے بیت المال کے نظام کو مزید وسعت دی، نئے شہر بسائے، اور زراعت و آبپاشی کے لیے نہروں اور بندوں کا ایک وسیع جال بچھا کر معاشی خوشحالی کا انقلاب برپا کیا۔ انھی بے مثال انتظامی، مذہبی اور فلاحی اصلاحات کی بدولت آپ کے کارہائے نمایاں کو آج بھی رہتی دنیا تک ایک بہترین مشعلِ راہ سمجھا جاتا ہے۔

اشاعتِ قرآن (جمعِ عثمانی)

آپ کے کارناموں میں عظیم ترین کارنامہ اشاعتِ قرآن ہے۔ جب قرآن مجید عرب سے

نکل کر عجم تک پہنچا تو اس وقت قرآن مجید پر اعراب حرکات وسکنات اور نقطے وغیرہ نہیں تھے۔ پھر لہجوں اور قرآت کا مختلف ہونا یہ اور زیادہ مسئلہ تھا۔ عجم کے لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب اذربائجان اور آرمینیہ کی فتح میں مشغول تھے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جو آنے والے واقعات اور پُرفتن حالات پر امتیازی نظر رکھتے تھے آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اختلاف قرات کی پریشان کن صورت حال کو بارگاہ خلافت میں بتایا کہ اے امیر المومنین اس امر کو سنبھال لیں اس سے پہلے کہ وہ قرآن میں اسی طرح کا اختلاف کرنے لگیں جیسا کہ یہود ونصاری نے کیا تھا۔

جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آذربائیجان کے عجمیوں کو قرآن پاک کی سورۃ فاتحہ میں انعمت ''ت'' کے پیش کے ساتھ پڑھتے سنا اور ان کی تصحیح کی تو وہ نہ مانے تب اس کے نتیجے میں انھوں نے یہ تشویش حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی اور انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قرآن پاک کی صرفی اور نحوی جیسا تحقیقی کام سونپا اور اس کے نتیجے میں کئی عظیم بنیادی فن وجود میں آئے جن میں فن تجوید میں حروف کا مخارج وصفات، فن صرف میں لفظی تحقیق اور فن نحو میں جملے کی ترکیب جیسے بڑے علم مدون ہوئے۔

اسلام دنیا بھر میں پھیل چکا تھا اور کئی ممالک اسلام کے زیر نگیں ہو کر اسلام قبول کر چکے تھے اور اب عرب کے ساتھ عجم یعنی غیر عرب لوگ مسلمان ہو چکے تھے جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ (آثار التنزیل علامہ تلخیص صفحہ 1 تا 212، خالد محمودؒ، تاریخ ابن کثیر جلد 7)

قران پاک پڑھنے میں عربی قبائل اور عجمی نومسلموں کی طرف سے اختلافات بڑھنے لگے اور سب اپنے اپنے تلفظ کو صحیح قرار دینے کے لیے جھگڑنے لگے قریب تھا کہ آپس میں تلواریں نکل جاتیں تو حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے مشورے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس نسخے کی (جو عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں تیار ہوا تھا) متعدد نقلیں اور کاپیاں تیار کروانے کا فیصلہ کیا اور باقی تمام نسخوں کو تلف کرنے کا فیصلہ کیا اس کام کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ہی مقرر کیا گیا جنہوں نے عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں وہ نسخہ جمع کیا تھا اور مدد کے لیے ان کے ساتھ مزید 11 افراد کی ٹیم تیار کر کے دی گئی اور یہ حکم دیا گیا کہ کتابت کی حد تک قرآن کو اسی لہجے اور تلفظ میں لکھا جائے جو رسول اللہ ﷺ کا تلفظ اور لہجہ تھا۔

پھر ایک ایک نسخہ ہر ہر صوبے اور ہر ہر چھاؤنی میں بھیج دیا گیا اور یہ فرمان جاری کیا گیا کہ اپنے

اپنے قبائل یا انفرادی لہجوں یا تلفظ کے لحاظ سے لکھے ہوئے جو جو قرآنی نسخے لوگوں کے پاس موجود ہوں وہ حکومت کے حوالے کردیے جائیں؛ تاکہ نسخوں کو جلا کر معدوم کردیا جائے۔

یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا امت پر بہت بڑا احسان ہے کہ کتابت قرآن کی حد تک انھوں نے قرآن میں وحدت کا رنگ پیدا کردیا؛ البتہ تلفظ میں رعایت رکھی گئی کہ جس کا جو تلفظ ہے وہ اسی تلفظ میں قرآن پڑھ سکتا ہے کیونکہ یہ کام ان کے بس میں بھی نہیں تھا ویسے بھی ایک حدیث میں آتا ہے کہ قرآن پاک ایک ہی حرف یعنی تلفظ پر نازل نہیں ہوا؛ بلکہ سبعہ احرف یعنی متعدد تلفظ پر نازل ہوا تو اس کی گنجائش موجود ہے۔ (التبیان فی مباحث القرآن)

آپؓ نے سات نسخے تیار کروا کر عالم اسلام میں پھیلا دیئے کہ باقی انھیں نسخوں سے نقول تیار کرائی جائیں۔ اس کے علاوہ تمام نسخے کو ضبط کرلیا جائے۔

اسلامی بحریہ (نیوی) کا قیام

اسلامی بحری بیڑی کے ذریعہ جنگ کا آغاز بھی آپ کے دور خلافت میں ہوا بقول ابن جریر حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی جان کی حفاظت کے پیش نظر اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ آپؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے اس حوالے سے تفصیلات بھی لی تھیں۔ نیز حضر معاویہؓ نے حضرت عمرؓ سے اصرار بھی کیا کہ وہ بحری جنگ کی اجازت بھی دیں؛ مگر آپ نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے منع کردیا تھا۔ (تاریخ طبری جلد سوم عہد عثمانی 28 ہجری)

ابن جریر لکھتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے انھیں بھی اس طرف بار بار متوجہ کیا، یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ نے اس کا ارادہ کیا تاہم آپ نے فرمایا کہ تم سپاہیوں کا انتخاب نہ کرو اور نہ قرعہ اندازی کرو؛ بلکہ انھیں اختیار دیدو کہ جو خوشی سے جانا چاہے اسے شامل کرو اور اس کو ساتھ لے جاؤ؛ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے ایسا ہی کیا اور بحری فوج پر عبداللہ بن قیس حارثی کو سپہ سالار بنایا۔

عبداللہ بن قیس حارثی نے اس جنگ میں پچاس حملے کیے کچھ موسم سرما میں اور کچھ موسم گرما میں۔ ان تمام حملوں میں نہ تو کوئی نقصان پہنچا اور نہ ہی کو غرق ہوا۔ تاہم عبداللہ بن قیس حارثی ایک حادثہ کی وجہ سے شہید ہوئے۔ (تاریخ طبری جلد دسوم صفحہ 194)

اس جنگ میں شامل ہونا مسلمان اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے پیشگی اس کی نہ صرف اطلاع دی تھی؛ بلکہ اس میں شامل مسلمانوں کو جنت کی بشارت بھی عطا فرمائی تھی۔

ام حرام بنت ملحانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کا پہلا لشکر جو سمندری غزوہ کرے گا، ان کے لیے (جنت) واجب ہوگئی''۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل قرآن، باب جمع القرآن)

ابن کثیر نے فتح اندلس اور قسطنطنیہ کے بارے لکھا ہے کہ جب افریقہ فتح ہوگیا تو حضرے عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن نافع بن عبد قیس اور حضرت عبداللہ بن نافع بن الحصینؓ (جو دونوں فہر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے) کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ فوراً اندلس پہنچ جائیں، پس وہ سمندر کے راستے سے اندلس آئے اور حضرت عثمانؓ نے اندلس جانے والوں کی طرف لکھا ''بلاشبہ قسطنطنیہ سمندر کی جانب فتح ہوگا اور جب تم اندلس فتح کروگے تو تم آخری زمانے میں قسطنطنیہ کے فاتحین کے ساتھ اجر وثواب میں شریک ہوگے''۔ راوی بیان کرتا ہے کہ انھوں نے اندلس جا کر اسے فتح کرلیا۔ (تاریخ ابن کثیر جلد 7 صفحہ 203)

وسیع فتوحات اور اشاعتِ اسلام

الکامل فی التاریخ جلد 3 میں علامہ ابن الاثیر نے خلافتِ عثمانی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں افریقہ (طرابلس وتیونس) کی فتوحات، حضرت عبداللہ بن ابی سرحؓ کی مہمات اور خراسان وطبرستان کی فتوحات ہوئیں۔ اس کے بعد آرمینیہ کو فتح کرکے مملکت اسلامیہ کا حصہ بنایا۔

جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ آپ کے دور خلافت میں بحری فوج کے ذریعہ قبرص اور افریقہ پر حملے کیے جس میں مشہور شہر جرجان، خراسان اور طبرستان فتح ہوئے۔ بعدازاں خراسان کے اکثر شہر نیشاپور، طوس، سرخس، اور بیہق فتح ہوئے۔ (تاریخ الخلفا سیوطی صفحہ 159، 160)

یہ وہ مردم خیز علاقے ہیں جن میں بعدازاں عالم اسلام کے جید علماء ومجتہدین اور فقہاء ومحدثین پیدا ہوئے اور ان کے پاس ہی ماوراء النہر کا علاقہ ہے۔

حافظ مجیب اللہ ندوی اسلامی فتوحات کی تلخیص کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عہد عثمانی میں ممالک محروسہ کا دائرہ نہایت وسیع ہوا۔ افریقہ میں طرابلس، برقہ اور مراکش (افریقہ) مفتوح ہوئے۔ ایران کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ ایران کے متصلہ ملکوں میں افغانستان خراسان اور ترکستان کا ایک حصہ زیرنگین ہوا۔ دوسری سمت آرمینیہ اور آذربائیجان مفتوح ہوکر اسلامی سرحد کوہ قاف تک پھیل گئے۔ اسی طرح ایشیائے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملک شام میں شامل کرلیا گیا۔ (سیر الصحابہ جلد اول صفحہ 177)

حضرت عمرؓ کی عالمی مہمات میں ایران، روم اور مصر کی عظیم سلطنتوں کی شکست اور ایک وسیع

سلطنت اسلامی کا قیام اور استحکام ہے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد یہ تینوں ملک پھر بغاوتوں کی لپیٹ میں آ گئے حضرت عثمانؓ نے ان تینوں مما لک کی بغاوتوں کو نہایت کامیابی سے سر کیا اور ان تینوں کے اردگرد کے اور بہت سے علاقے بھی محروسہ اسلام میں شامل کیے۔ (خلفاء تاشدین جلد دوم صفحہ 323، علامہ خالد محمودؒ)

مسجد نبوی ﷺ اور مدینہ منورہ کی تعمیر وتوسیع

حضرت عثمانؓ کے عظیم کارناموں میں ایک مسجد نبوی ﷺ کی توسیع اور مدینہ منورہ کو محفوظ بنانا بھی شامل ہے۔ جو آپ کے عشقِ رسول ﷺ کا بین ثبوت ہے۔ علامہ بلاذری مدینہ کو سیلاب سے محفوظ کرنے کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مہزور کے سیلاب کی وجہ سے المدینہ ڈوبنے کے بالکل قریب تھا، انھوں نے اس کے لیے بند بندھوایا۔'' (فتوح البلدان صفحہ 33)

اسی طرح مسجد کی توسیع کے حوالے سے علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ 29 ہجری میں اصطخر اور قسار فتح ہوئے اور اسی سال آپؓ نے مسجد نبوی ﷺ میں توسیع کی، ترشیدہ پتھروں سے اس کی تعمیر کی، اس کے ستون بھی پتھر کے بنوائے اور چھت میں ساگوان لگوایا، مسجد کا طول ایک سو ساٹھ ہاتھ اور عرض ایک سو پچاس ہاتھ رکھا۔ (تاریخ الخلفا للسیوطی، صفحہ 160)

مولانا مجیب اللہ ندوی نے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

مسجد نبوی کی تعمیر میں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالی عنہ کا ہاتھ سب سے زیادہ نمایاں ہے عہد نبوی میں جب مسلمانوں کی کثرت کے باعث مسجد کی وسعت ناکافی ثابت ہوئی تو اس کی توسیع کے لیے حضرت عثمان نے قریب کا قطعہ زمین خرید کر بارگاہ نبوت میں پیش کیا پھر اپنے عہد میں بڑے اہتمام سے اس کی وسیع اور شاندار عمارت تعمیر کروائی، سب سے اول 24 ہجری میں اس کا ارادہ کیا؛ لیکن مسجد کے گردوپیش جن لوگوں کے مکانات تھے وہ کافی معاوضہ دینے پر بھی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت کے شرف سے دست کش ہونے کے لیے راضی نہ ہوئے حضرت عثمان نے ان لوگوں کو راضی کرنے کے لیے مختلف تدبیریں کیں؛ لیکن وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے یہاں تک کہ پانچ سال اس میں گزر گئے بالآخر 29 ہجری میں حضرت صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ نے جمعہ کے روز ایک نہایت ہی موثر تقریر کی اور نمازیوں کی کثرت اور مسجد کی تنگی کی طرف توجہ دلائی، اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے خوشی سے اپنے مکانات دے دیے اور آپؓ نے نہایت

اہتمام کے ساتھ تعمیر کا کام شروع کیا، نگرانی کے لیے تمام عمال طلب کیے اور خود شب و روز مصروف کار رہتے تھے۔ غرض دس مہینوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد اینٹ چونا اور پتھر کی ایک نہایت خوش نما اور مستحکم عمارت تیار ہوگئی وسعت میں بھی کافی اضافہ ہوگیا یعنی طول میں 50 گز کا اضافہ ہوا؛ البتہ عرض میں کوئی تغیر نہیں کیا گیا۔ (سیر الصحابہ جلد اول صفحہ ۱۷۹)

خلاصہ یہ کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بارہ سالہ دورِ خلافت اسلامی تاریخ کا وہ زریں ورق ہے جس نے امتِ مسلمہ کو رفعت، وحدت اور وسعت کے لازوال تحائف سے نوازا۔ آپؓ کے عہدِ مبارک کا سب سے عظیم اور لافانی کارنامہ ''تدوین واشاعتِ قرآن'' ہے؛ جب لہجوں کے اختلاف اور عجمی فتنوں کے سدِ باب کے لیے آپؓ نے فہمِ فاروقی و مشورہِ حذیفہ کی روشنی میں امت کو ایک مصحفِ امام اور یکساں لہجے پر متحد کر کے ''جامع القرآن'' کا ابدی لقب پایا۔ معاشی و عسکری میدان میں آپؓ نے دور اندیشی کی نئی تاریخ رقم کرتے ہوئے پہلی بار ''اسلامی بحریہ (نیوی)'' کی بنیاد رکھی، جس نے سمندری افق پر بھی پرچمِ اسلام کو ناقابلِ شکست بنا کر بشارتِ نبوی ﷺ کو سچ کر دکھایا۔ عزمِ عثمانی کی بدولت افریقہ، اندلس، خراسان، آرمینیہ اور آذربائیجان جیسے دور دراز خطے اسلامی قلمرو کا حصہ بنے اور عہدِ فاروقی کی فتوحات کے استحکام کے ساتھ بغاوتوں کا جڑ سے خاتمہ ہوا۔ زراعت و آبپاشی کے لیے نہروں اور مدینہ کو سیلاب سے بچانے کے لیے بندوں کی تعمیر نے معاشی خوشحالی کا انقلاب برپا کیا۔ مزید برآں، عشقِ رسول ﷺ کے اعجاز سے آپؓ نے مسجدِ نبوی ﷺ کی ترشیدہ پتھروں اور ساگوان کی لکڑی سے حسین و وسیع تجدید کروائی۔ الغرض، جامعِ قرآن، پیکرِ جود و سخا کا یہ دورِ زریں اپنے مذہبی، انتظامی، عسکری اور فلاحی اقدامات کی بدولت رہتی دنیا تک امن، ترقی اور عروج کا ایک بے مثال دور تھا جو کہ آج بھی مشعلِ راہ ہے۔

* * *

حضرت خالد بن ولیدؓ کی پگڑی کا اُتارا جانا

(ایک تاریخی واقعے کی تحقیق اور اس کے پس منظر کا مطالعہ)

از: مفتی محمد فیاض قاسمی
رہوا، رامپور، وارث نگر، سمستی پور

اسلامی تاریخ کے صفحات میں بعض واقعات ایسے ہیں جو بظاہر مختصر ہوتے ہیں، لیکن ان کے اندر عہدِ صحابہؓ کے نظمِ حکومت، احتساب، اطاعتِ امیر اور باہمی احترام کی پوری تصویر سمٹ آتی ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قنسرین کی ولایت سے معزولی اور اس موقع پر حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں عمامہ کھولنے کا واقعہ بھی انھیں واقعات میں سے ہے۔

یہ واقعہ عوامی مجالس اور بعض تحریروں میں کبھی اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا پاؤں ان کی پگڑی سے باندھنے کا حکم دیا تھا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بہ حیثیت امیر اس حکم کو نافذ کیا؛ لیکن جب اصل تاریخی روایت کی طرف رجوع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعے کی اصل صورت اس سے قدرے مختلف ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ اسے جذباتی یا روایتی انداز کے بجائے تاریخی ماخذ کی روشنی میں دیکھا جائے۔

واقعہ کی تاریخ

یہ واقعہ مشہور تاریخی روایت کے مطابق سنہ 17 ہجری میں پیش آیا۔ اس وقت امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے اور شام کی مختلف سرحدی و انتظامی اکائیوں پر متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مقرر تھے۔ اس زمانے میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ شام کے بڑے امیر تھے؛ جب کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ قنسرین کے والی تھے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت کام کرتے تھے۔ ابن جریر طبری نے اس دَور کی انتظامی صورت حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حمص پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا اختیار تھا، خالد رضی اللہ عنہ قنسرین میں ان کے ماتحت

تھے، جبکہ دمشق اور دوسرے علاقوں کے لیے الگ الگ عامل مقرر تھے۔(تاریخ طبری جلد ٤، ذکرخبر عزل خالد بن ولید). لہٰذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس واقعہ کے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ نہ شام کے حاکم تھے، نہ دمشق کے امیر، نہ قنسرین کے والی اور نہ ہی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے برابر کسی انتظامی منصب پر فائز تھے۔

واقعہ کا آغاز

کتبِ تاریخ میں ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ نے رومی سرحد کی طرف ایک فوجی مہم کی۔ اس مہم سے واپسی پر مسلمانوں کے ہاتھ خاصا مال آیا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس مال موجود ہے تو بعض لوگ ان کے پاس انعام کی امید سے آنے لگے۔ انھیں لوگوں میں اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ طبری کی روایت کے مطابق اشعث بن قیس حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس قنسرین پہنچے اور حضرت خالد نے انھیں دس ہزار عطا کیے۔ "فإن الأشعث بن قيس ممن انتجع خالدا بقنسرين، فأجازه بعشرة آلاف"۔ یعنی اشعث بن قیس ان لوگوں میں تھے جو قنسرین میں خالد کے پاس آئے اور خالد نے انھیں دس ہزار عطا کیے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اصل روایت میں صرف ''دس ہزار'' کا ذکر ہے؛ اس رقم کو کسی خاص کرنسی، مثلاً درہم یا دینار، کے ساتھ متعین نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس رقم کو حضرت خالد کی شان میں قصیدہ گوئی کی اجرت قرار دیا گیا۔

امیرالمومنین حضرت عمرؓ کی کارروائی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرف سے اشعث کو اتنی بڑی رقم دیے جانے کی خبر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو انھوں نے معاملے کی تحقیق ضروری سمجھی؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام ایک تحریر روانہ کی۔ اس تحریر میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حاضر کرنے، ان کی پگڑی کھولنے، ٹوپی اتارنے اور پگڑی کے ذریعہ انھیں باندھنے کا حکم دیا گیا، تاکہ معلوم ہو کہ اشعث کو دی گئی رقم کہاں سے آئی تھی۔ طبری کی روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے الفاظ یہ ہیں: "أن يقيم خالدا ويعقله بعمامته، وينزع عنه قلنسوته حتى يعلمهم من أين إجازة الأشعث؛ أمن ماله أم من إصابة أصابها؟ فإن زعم أنها من إصابة أصابها فقد أقر بخيانة، وإن زعم أنها من ماله فقد أسرف. وأعزله على كل حال، وأضمم إليك

عمله". یعنی خالد کو حاضر کیا جائے، انھیں ان کی عمامہ کے ذریعہ مقید کیا جائے اور ان کی ٹوپی اتاری جائے، یہاں تک کہ معلوم ہوجائے کہ اشعث کو دی گئی رقم ان کے اپنے مال سے تھی یا جنگ میں حاصل ہونے والے مال سے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی حکم میں یہ بھی واضح کیا کہ اگر حضرت خالد کہیں کہ رقم جنگ میں حاصل ہونے والے مال سے دی تھی تو یہ خیانت ہوگی اور اگر کہیں کہ اپنے مال سے دی تھی تو یہ اسراف ہوگا؛ چنانچہ دونوں صورتوں میں انھیں ان کے منصب سے معزول کرنے کا حکم دیا گیا۔

ایک بنیادی تاریخی تصحیح

یہی وہ مقام ہے جہاں عوامی روایت اور اصل تاریخی عبارت میں فرق سامنے آتا ہے؛ چنانچہ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا پاؤں ان کی پگڑی سے باندھنے کا حکم دیا''؛ لیکن اصل تاریخی روایت میں ''پاؤں'' کا لفظ نہیں ہے۔ طبری کے الفاظ ہیں: "ویعقله بعمامته". یعنی انھیں ان کے عمامہ سے باندھا جائے۔ اور ابن کثیر کے ہاں: "ویقید بعمامته" ہے۔ یعنی انھیں عمامہ کے ذریعہ مقید کیا جائے؛ اس لیے پاؤں کو پگڑی سے باندھنے کی قطعی تعبیر اختیار کرنا مناسب نہیں؛ لہٰذا زیادہ درست بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ان کی پگڑی کے ذریعہ مقید کرنے کا حکم دیا تھا۔

حضرت خالدؓ کی پیشی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم پہنچنے کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس طلب کیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا اور منبر پر بیٹھ گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ان کے سامنے موجود تھے۔ اس منظر میں اسلامی حکومت کے نظم وضبط کی ایک اہم تصویر نظر آتی کہ ہے ایک طرف وہ خالد بن ولید ہیں جنھوں نے اسلامی فتوحات میں غیر معمولی کردار ادا کیا اور دوسری طرف وہ امیر ہیں جنھیں خلیفہ وقت کا حکم پہنچا ہے اور جن کے لیے اس حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ الغرض حضرت خالد رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے اور انھیں کی مجلس میں یہ کارروائی عمل میں آئی۔ معلوم ہوا کہ یہ عدالت یا یہ مجلس حضرت بلالؓ کی نہیں تھی۔ (حوالہ بالا)

حضرت ابوعبیدہؓ کی خاموشی

اس موقع پر تاریخی روایت ایک نہایت مختصر مگر معنی خیز جملہ نقل کرتی ہے: "وأبو عبيدة ساكت

لا يقول شيئا". ابوعبیدہ خاموش رہے، کچھ نہیں بول رہے تھے۔ ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ خاموش رہے؛ لیکن روایت ان کی خاموشی کی کوئی صریح وجہ بیان نہیں کرتی۔ اس لیے اس خاموشی کے بارے میں کسی مخصوص نفسیاتی یا جذباتی سبب کو یقینی طور پر بیان کرنا درست نہیں ہوگا۔

حضرت بلالؓ کا اقدام

اسی مجلس میں حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے آنے والے سرکاری قاصد نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے سوال کیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فوری جواب نہیں دیا اور ادھر حضرت ابوعبیدہؓ بھی خاموش تھے؛ تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ روایت کے الفاظ ہیں: "فقام البريدُ فسأل خالدا"... "وأبو عبيدة ساكت لا يقول شيئا"... "فقام بلال فقال: إن أمير المؤمنين أمَرَ فيك بكذا وكذا". بلال کھڑے ہوئے اور کہا: امیر المؤمنین نے آپ کے بارے میں یہ یہ حکم دیا ہے۔ اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی پگڑی کھولی، ان کی ٹوپی اتاری اور انھیں عمامہ کے ذریعہ مقید کردیا۔ (تناولَ عمامتَه فنقضها، وضع قَلَنْسُوَتَه فعَقلَه بعمامته). یہاں ایک بات نہایت صاف ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا تھا۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں: "إن أمير المؤمنين أمر فيك..." یعنی امیر المؤمنین نے یہ حکم دیا ہے۔ لہٰذا یہ کسی شخصی اختیار یا ذاتی اقدام کا واقعہ نہیں تھا، بلکہ خلیفہ وقت کے حکم کی تعمیل تھی۔

حضرت بلالؓ کا منصب

اس واقعہ کے سلسلے میں ایک سوال خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت بلالؓ کے ہاتھوں جب پگڑی کے اتارے جانے کا عمل پیش آیا، تو کیا وہ بھی اس وقت کسی سرکاری عہدہ اور منصب پر فائز تھے؟ تو جواب یہ ہے کہ اس واقعہ کی اصل روایت میں انھیں کسی والی، حاکم، قاضی یا امیرِ لشکر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا؛ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس وقت شام یا دمشق کے حاکم تھے یا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی جگہ کوئی حکومتی اختیار رکھتے تھے۔ اسی طرح انھیں اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ''برید'' یعنی سرکاری قاصد بھی قرار نہیں دیا جاسکتا؛ کیوں کہ روایت میں "البريد" کا الگ ذکر ہے اور اس کے بعد الگ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کھڑے ہونے کا بیان ہے؛ چنانچہ تاریخی طور پر محتاط تعبیر یہی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس وقت شام میں موجود

ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ جہاد میں شریک ہوا کرتے تھے اور اس مخصوص کارروائی میں انھوں نے صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کی۔ رہی بات حکومت کی، تو اس وقت کے حاکم اور خلیفہ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ شام کے بڑے امیر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے اور ان کے ماتحت قنسرین کے والی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے؛ مگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس انتظامی سلسلے میں کسی ولایت کے حاکم نہیں تھے۔

رقم کا حصول اور خیانت کا ثبوت

جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے اشعث بن قیس کو دی گئی رقم کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: "بَل مِنْ مَالي"؛ بلکہ وہ رقم خود میرے اپنے مال سے تھی۔ یہ جواب ملنے کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو آزاد کر دیا، ان کی ٹوپی واپس کی اور ان کی پگڑی دوبارہ باندھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحقیق اس لیے کرائی تھی کہ معلوم ہو کہ اشعث کو دی گئی رقم کس مال سے تھی۔ اس پورے واقعہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرف سے مالِ مسلمین میں خیانت ثابت ہونے کا کوئی فیصلہ موجود نہیں اور اس کارروائی کا اختتام اسی مجلس میں کر دیا گیا اور انھیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا گیا۔

حضرت بلالؓ نے خود عمامہ باندھا

یہ واقعہ کا نہایت اہم حصہ ہے؛ کیونکہ اگر کوئی شخص صرف عمامہ کھولنے والی تفصیل بیان کرے اور اس کے بعد کا حصہ چھوڑ دے تو واقعہ کی تصویر ادھوری رہ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جانب سے رقم کی وضاحت کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے انھیں کھول کیا، ٹوپی واپس پہنائی اور پھر ان کی پگڑی اپنے ہاتھ سے باندھی۔ (فَاطلَقَه واعادقلنسوتَه، ثم عَمَّمَه بِيَدِه)۔ اس موقع پر حضرت بلالؓ سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں: "نَسمَعُ ونُطِيعُ لِوُلاتِنَا ونفخم ونخدم موالينا." ہم اپنے حکام کی بات سنتے اور اطاعت کرتے ہیں اور اپنے بڑوں کی تعظیم اور خدمت کرتے ہیں۔ یہ الفاظ واقعہ کے مزاج کو سمجھنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلے امیر المؤمنین کے حکم کی تعمیل ہوئی، پھر جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرف سے وضاحت آ گئی تو کارروائی ختم کر دی گئی اور ان کی ظاہری عزت بحال کر دی گئی؛ اس لیے صرف یہ کہنا کہ حضرت بلالؓ نے خالدؓ کی پگڑی اتار کر انھیں ذلیل کیا، تاریخی روایت کے پورے متن کی ترجمانی نہیں کرتا۔ روایت کا اختتام اس کے بالکل برعکس ایک ایسے منظر پر ہوتا ہے جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ خود ان کی پگڑی دوبارہ باندھتے ہیں۔

وضاحت کے بعد بھی حضرت خالدؓ کی معزولی

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کے بارے میں روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک اہم وضاحت نقل ہوئی ہے۔ ابن کثیر کے بیان کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعد میں لوگوں کے سامنے واضح کیا کہ انھوں نے خالد کو کسی ناراضگی یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا؛ بلکہ انھیں اندیشہ تھا کہ لوگ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوکر فتوحات کو رب تعالی کی نصرت کے بجائے ان کی ذات سے وابستہ نہ کرنے لگیں؛ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے خلاف ذاتی دشمنی یا بغض کا دعویٰ تاریخی روایت کے مجموعی بیان سے ثابت نہیں ہوتا۔

معزولی کے بعد

حضرت خالد رضی اللہ عنہ قنسرین سے روانہ ہوئے، لوگوں سے رخصت ہوئے اور پھر حمص کی طرف گئے۔ بعد میں وہ مدینہ منورہ پہنچے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ تاریخی روایتوں میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان اس معاملے پر گفتگو بھی نقل ہوئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کو ان کی اسلامی خدمات، شجاعت یا صحابیت کی تنقیص کے معنی میں نہیں لینا چاہیے۔ کیوں کہ عہدہ ایک انتظامی ذمہ داری ہے، جبکہ صحابیت اور دینی فضیلت الگ حیثیت رکھتی ہے۔

واقعہ کا سیاق وسباق اور عجیب تاریخی منظر

ایک طرف خلیفہ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں، جن کے نزدیک ایک بڑے سے بڑے سپہ سالار کو بھی احتساب سے بالاتر نہیں سمجھا جاسکتا۔ دوسری طرف حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہیں، جو شام کے بڑے امیر ہیں اور جنہیں خلیفہ وقت کا حکم موصول ہوتا ہے۔ سامنے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہیں، جو اپنی عسکری عظمت کے باوجود حکومتی نظم سے باہر نہیں (فلم یمنعه سمعاً و طاعةً) اور سپہ سالار اعظم ہونے کے باوجود ریاستی نظم وضبط کو مقدم رکھا۔ ادھر حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ ہیں، جو کسی منصبِ حکومت کی وجہ سے نہیں، بلکہ حکمِ امیر کی تعمیل کی وجہ سے اس واقعے میں نمایاں ہوتے ہیں۔ حکم آتا ہے، کارروائی ہوتی ہے، سوال کیا جاتا ہے، جواب ملتا ہے اور پھر کارروائی ختم کردی جاتی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ پہلے عمامہ کھولتے ہیں اور پھر اسی عمامہ کو اپنے ہاتھ سے دوبارہ باندھتے ہیں۔ یہی آخری منظر اس واقعے کو محض ایک سخت انتظامی

کارروائی کے بجائے ایک ایسے تاریخی واقعے میں بدل دیتا ہے جس میں حکم کی اطاعت کے ساتھ شخصیت کی تکریم بھی باقی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پورے واقعہ کا اخیر حصہ جو مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ کی گفتگو کا ٹکڑا ہے، اس میں تو ایک دوسرے کے تئیں تعظیم وتکریم کے باضابطہ واضح الفاظ درج ہیں: ''اور عمر نے مختلف شہروں کے حکام کے نام لکھا کہ میں نے خالد کو کسی ناراضی یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا؛ بلکہ لوگوں نے انھیں بہت بڑا مقام دے دیا تھا اور ان کے بارے میں فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ لوگ ان ہی پر بھروسا کرنے لگیں گے؛ اس لیے میں نے پسند کیا کہ لوگ جان لیں کہ کارساز اور کام بنانے والا اللہ ہی ہے اور یہ کہ وہ کسی فتنے کے خطرے میں نہ پڑیں''۔ (الکامل فی التاریخ لابن الاثیر. باب ذکر عزل خالد بن ولیدؓ وتاریخ طبری جلد۴، ذکر خبر عزل خالد بن ولید)

الغرض اس واقعے کی سب سے بڑی معنویت یہی ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں عظمتِ شخصیت اور نظمِ حکومت ایک دوسرے کے مقابل نہیں تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنی عظمت کے باوجود احتساب سے بالاتر نہیں تھے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی حکمِ امیر کی تعمیل میں کسی زیادتی کے مرتکب یا کسی بڑپن کے زعم کا شکار نہیں ہوئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ منصبِ امارت پر فائز ہونے کے باوجود اپنے ساتھی اور رفیق کی عزت وحرمت سے بے نیاز نہیں تھے۔ یہی وہ توازن ہے جسے اس تاریخی واقعے کو بیان کرتے ہوئے برقرار رکھنا چاہیے۔

* * *

مراجع:

(۱) محمد بن جریر الطبری، تاریخ الأمم والملوک، حوادث سنہ ۱۷ ہجری، واقعہ عزل خالد بن الولید عن قنسرین۔

(۲) اسماعیل بن عمر ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، حوادث سنہ ۱۷ ہجری، واقعہ عزل خالد بن الولید عن قنسرین۔

(۳) عزالدین ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، حوادث سنہ ۱۷ ہجری۔

(۴) ابن عساکر، تاریخ دمشق، ترجمہ خالد بن الولید اور اس سے متعلق منقول تاریخی روایات۔

* * *

حضرت معاویہؓ پر ایک سنگین الزام اور اس کی حقیقت

حسن فرحان مالکی اور ایرانی عالم علی کورانی عاملی کی خیانت اور تحریفات

از: مولانا یحییٰ نعمانی
لکھنؤ

اہل نظر واقف ہیں کہ گزشتہ چند سالوں سے پوری دنیا میں شیعیت کی تبلیغ اور صحابۂ کرام پر تہمتیں لگانے اور ان سے بدظن ومتنفر کرنے کی، ایک وسیع وطاقت ور تحریک چل رہی ہے۔ جو خاص طور پر سوشل میڈیا پر بہت سرگرم ہے۔ اس پروپیگنڈے میں اہل سنت کی کتابوں کے حوالوں سے اور پوری تلبیس اور خیانت کے ساتھ لوگوں کے ذہن میں شبہات کی پوری پوری (Dose) اتاری جارہی ہے۔ رافضی کذاب راویوں کی موضوع اور باطل ومنکر روایات کو صحیح احادیث اور حقائق وواقعات بتایا جارہا ہے۔

حسرت وافسوس کا مقام ہے کہ بے شمار نوجوان، حتیٰ کہ بہت سے فارغین مدارس بھی اپنی سادہ لوحی اور کم علمی کی وجہ سے اس کے شکار بن رہے ہیں۔ شیعہ علماء اور دانشوروں کے علاوہ اس کام میں سنی کہلانے والے کچھ ایسے لوگوں کو بھی آلہ کار بنالیا گیا ہے، جو یا تو علم کے کچے تھے اور دام فریب میں پھنسائے گئے تھے یا بدقسمتی سے کسی اور وجہ سے اس تحریک کے لیے استعمال ہونے پر آمادہ وتیار ہوگئے۔

حسن فرحان مالکی نامی ایک شخص ہیں، جو موجودہ دور میں شیعیت کی دعوت کے ایک بڑے نمائندے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے کا بڑا مواد تیار کیا ہے۔ ان کی تحریریں، تحریف ودجل اور مکر وخیانت سے بھری ہوتی ہیں۔ بلاشبہ اور بلا مبالغہ وہ ان چیزوں میں حیرت ناک مہارت رکھتے ہیں۔ شیعیت کے داعی ان کی تحریریں فارغین مدارس میں بڑے دعووں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یوں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ''یہ اس موضوع کے بڑے محقق محدث ہیں۔'' جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان

موضوعات پر ان صاحب کی ہر تحریر خیانتوں اور دجل وکذب سے بھری ہوتی ہے۔ وہ خیانت میں اس قدر جری ہیں کہ کذاب راوی کو ثقہ، شیعہ راوی کو سنّی اور جھوٹی سند کو صحیح بتانا ان کا معمول ہے۔

ایک عزیز نے جو فارغ التحصیل ندوی ہیں، مجھے ان کی ایک تحریر کا اقتباس بھیجا جس میں سیدنا حضرت معاویہؓ پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ اپنی خلافت کے دور میں اعلانیہ شراب پیتے تھے اور وہ بھی حضرت بریدہ بن حصیب اسلمیؓ جیسے بڑے عالم اور بلند مقام صحابی کے سامنے۔ حضرت بریدہ کو بھی شراب پیش کی جاتی ہے، وہ پیتے تو نہیں؛ لیکن اس ''بزمِ مے'' میں شریک رہتے ہیں اور کسی قسم کی نکیر نہیں کرتے۔ حسن فرحان کہتے ہیں کہ یہ بات مسند احمد (38 /25-26) میں صحیح سند سے موجود ہے۔[1] موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

وكان معاوية يشرب الخمر، كما في حديث بريد بن الحصيب الذي أخرجه أحمد، ففي مسند أحمد: 25/38 حَدَّثَنَا زَيْدُ بْنُ الْحُبَابِ، حَدَّثَنِي حُسَيْنٌ، حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ بُرَيْدَةَ قَالَ: دَخَلْتُ أَنَا وَأَبِي عَلَى مُعَاوِيَةَ فَأَجْلَسَنَا عَلَى الْفُرُشِ، ثُمَّ أُتِينَا بِالطَّعَامِ فَأَكَلْنَا، ثُمَّ أُتِينَا بِالشَّرَابِ فَشَرِبَ مُعَاوِيَةُ، ثُمَّ نَاوَلَ أَبِي، ثُمَّ قَالَ: مَا شَرِبْتُهُ مُنْذُ حَرَّمَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اهـ والسند صحيح، وها هو معاوية يشرب؛ وجهرًا وأمام صحابي كبير.[2]

(ترجمہ) معاویہ شراب پیا کرتے تھے؛ جیسا کہ بریدہ بن الحصیب کی حدیث میں ہے۔ چنانچہ مسند احمد (38 /25) میں ہے کہ:

عبداللہ بن بریدہ کہتے ہیں کہ میں اور میرے والد (بریدہ بن حصیب) معاویہ کے پاس گئے، تو انھوں نے ہمیں قالین پر بٹھایا، پھر ہمارے پاس کھانا لایا گیا تو ہم نے کھایا، پھر ہمارے پاس مشروب لایا گیا۔ تو معاویہؓ نے پیا، پھر انھوں نے وہ میرے والد صاحب کو دیا پھر کہا: جب سے رسول اللہ ﷺ نے اُسے حرام کیا ہے، میں نے کبھی اسے نہیں پیا۔

اور اس کی سند صحیح ہے، یہ دیکھیے معاویہ شراب پی رہا ہے، وہ بھی اعلانیہ اور ایک جلیل القدر صحابی کے سامنے۔

میں نے ان کو جواب لکھا ہے کہ:

عزیزم! شیعی ذہن کو صحابہ پر الزام لگانے کے لیے شیعی ذہن کو کس طرح کی کارستانیوں پر اترنا

پڑتا ہے اور وہ کس جرأت کے ساتھ تحریف وتلبیس کرتا ہے، یہ اعتراض اس کی مثال ہے۔ یہ حدیث مسند احمد میں (22941) پر پائی جاتی ہے۔ معترض نے یہاں اس میں کئی خیانتیں کی ہیں اور کئی فریب دیے ہیں:

(۱) پہلی خیانت یہ کہ اس روایت میں کہیں شراب کا ذکر نہیں ہے (عربی میں شراب کو خمر کہتے ہیں)۔ روایت میں جو عربی لفظ ''شراب'' ہے، اس کے معنی مشروب کے ہوتے ہیں۔ یعنی روایت میں صرف کسی مشروب کے پینے کا تذکرہ ہے۔ اگر راوی یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ معاویہ نے شراب پی، تو وہ عربی کا عام لفظ ''خمر'' کہتا۔ سوال یہ ہے کہ اس نے یہ عام لفظ کیوں نہیں بولا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی اور مشروب تھا۔ ظاہر بات ہے حضرت معاویہؓ اور حضرت بریدہ بن حصیب اسلمیؓ کی مجلس میں شراب کا کیا سوال؟

(۲) دوسری یہ کہ معترض نے اس روایت کی تشریح وتفہیم میں کھلی تحریف کی ہے۔ روایت میں تو واضح طور پر حضرت معاویہ کا یہ اظہار واعلان ہے کہ ''اُس'' کے حرام کیے جانے کے بعد تو میں نے اس کو کبھی منہ نہیں لگایا؛ مگر ان صاحب نے اپنی تہمت کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے دجل وتلبیس سے کام لیتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے اس جملے کو حضرت بریدہ بن حصیب اسلمیؓ کا جملہ بنا دیا۔ جب کہ یہ حضرت معاویہؓ کا جملہ ہے۔ جملے کی ساخت ایسی ہے کہ کوئی اوسط درجے کا عربی داں بھی یہ سمجھنے میں غلطی نہیں کرے گا کہ یہ جملہ حضرت معاویہؓ کا ہے۔

أُتِينَا بِالشَّرَابِ فَشَرِبَ مُعَاوِيَةُ ثُمَّ نَاوَلَ أَبِي ثُمَّ قَالَ: مَا شَرِبْتُهُ مُنْذُ حَرَّمَهُ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم.

مشروب لایا گیا تو معاویہؓ نے پیا، پھر انھوں نے وہ مشروب میرے والد صاحب کو دیا پھر کہا: جب سے رسول اللہ ﷺ نے ''اُس'' (۳) کو حرام قرار دیا ہے، میں نے اُس کو کبھی نہیں پیا۔

بہرحال اس کے قائل صرف حضرت معاویہ ہی ہو سکتے ہیں، حضرت بریدہ ہرگز نہیں؛ مگر تحریف کرنے والے نے ضمیر بجائے حضرت معاویہؓ کے حضرت بریدہ بن حصیب کی طرف لوٹا دی۔ اگرچہ یہ بات کہ اس ضمیر سے مراد حضرت معاویہؓ ہیں، اوسط درجے کا عربی ذوق رکھنے والے کے لیے بھی واضح تھی۔ (فَشَرِبَ مُعَاوِيَةُ ثُمَّ نَاوَلَ أَبِي ثُمَّ قَالَ)۔

(۳) تیسری خیانت میں تو موصوف نے حد ہی کر دی۔ اور وہ یہ کہ اسی روایت میں حضرت معاویہ کا ایک اور جملہ صاف موجود ہے۔ جس کے بعد کوئی گنجائش ہی نہیں بچتی کہ اس روایت میں کہیں

کسی ''شراب'' (خمر) کا امکان بھی بچے۔ روایت بتاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے دوران گفتگو فرمایا کہ:

''کفر کے دور میں جو مشروبات اچھے لگتے تھے، ان میں سے اب صرف دودھ کی رغبت ہے اور وہی لینے کا معمول ہے۔''

ثُمَّ قَالَ مُعَاوِيَةُ: كُنْتُ أَجْمَلَ شَبَابِ قُرَيْشٍ وَأَجْوَدَهُ ثَغْرًا، وَمَا شَيْءٌ كُنْتُ أَجِدُ لَهُ لَذَّةً كَمَا كُنْتُ أَجِدُهُ وَأَنَا شَابٌّ غَيْرُ اللَّبَنِ، أَوْ إِنْسَانٍ حَسَنِ الْحَدِيثِ يُحَدِّثُنِي (مسند احمد: 22941).

پھر معاویہؓ نے کہا: میں قریش کا سب سے خوبصورت وزیبا خند جوان تھا۔ جوانی میں جو چیزیں مجھے مرغوب تھیں، ان میں اب بس دودھ ہے، جو اچھا لگتا ہے۔ اور یہ کہ کوئی خوش گفتار انسان مجھ سے باتیں کرے۔(۴)

ذرا سوچیے! اگر اسی مجلس میں معاویہؓ شراب پی رہے ہوتے تو کیا یہ جملہ کہا جاسکتا تھا؟ معمولی سی سمجھ رکھنے والا بھی جان لے گا کہ یہ جملہ تو شراب کی تہمت کا کوئی امکان ہی نہیں چھوڑتا۔ لہٰذا حسن فرحان صاحب نے روایت کے اس صاف صراحت والے جملے کو اڑا دیا۔ ان کی یہ خیانت تو پچھلی دونوں سے بھی زیادہ بے شرم قسم کی خیانت ہے۔ اب ذرا دیکھیے! ان صاحبوں نے حضرت معاویہؓ کو مطعون کرنے کے لیے مندرجہ ذیل یہ تین تین خیانتیں کیں:

۱- روایت تو کسی ''مشروب'' کے پیے جانے کا ذکر کر رہی ہے، وہاں ''خمر'' یعنی شراب کا نام ہی نہیں ہے۔ تحریف کرنے والے نے دجل اور تلبیس کے ساتھ اس سے خمر یعنی شراب مراد لے لی۔

۲- اسی مجلس میں حضرت معاویہؓ کہہ رہے ہیں کہ الحمدللہ حرمت کے بعد کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ شیعی ذہنیت کی کارستانی دیکھیے اس کو حضرت بریدہؓ کا جملہ بنا دیا۔

۳- پھر آگے روایت میں صاف صاف یہ بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''اسلام سے پہلے کے جو مشروبات اچھے لگتے تھے ان میں سے اب صرف دودھ ہے جو اچھا لگتا ہے''؛ مگر حسن فرحان صاحب نے روایت کے اس جملہ کو صاف غائب کر دیا۔

اس ڈھٹائی کے ساتھ دجل وتلبیس اور تحریف کرنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی دل سخت نہ کر دیا جائے دین کے معاملے میں کوئی اس بے باکی سے جھوٹ نہیں بولے گا۔

اس سے بھی زیادہ بے حیائی!

حسن فرحان مالکی لکھتے ہیں:

ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' (5 /42) میں کہا ہے: اسے احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح (بخاری/مسلم) کے راوی ہیں۔ ہیثمی مزید کہتے ہیں:

یہاں ''معاویہؓ کے کلام میں کچھ (مزید) بات تھی جسے میں نے چھوڑ دیا ہے۔''

بس کیا تھا؟ موصوف کو موقع مل گیا ابن حجر ہیثمی کے بہانے اہل سنت کی پوری تاریخ پر کتمان کا الزام لگانے کا۔ فرماتے ہیں:

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اِس شخص کی کتنی (فضائح) رسوا کن بداعمالیاں ہم نے ذکر کرنے سے چھوڑ دی ہیں۔ (یعنی چھپالی ہیں)؛ کیونکہ معاویہ کے دور سے لے کر ہمارے اس دور تک لوگ ہمیشہ ایسی باتوں کو چھوڑتے (حذف کرتے) آئے ہیں جو ''العامۃ''(۵) (یعنی سنیوں) کو ناراض کرسکتی تھیں اور شاید میں جانتا ہوں کہ معاویہ نے یہاں کیا کہا ہوگا۔

حسن فرحان صاحب نے یہاں جان بوجھ کر یہ تلبیس فرمائی ہے کہ یہاں کوئی ایسی چیز حذف کی گئی ہے جس سے حضرت معاویہؓ کی ''رسوا کن بداعمالیوں'' کا پتہ چلتا تھا۔ مسند احمد کی روایت تو ان کے سامنے ہے، وہ کیوں نہیں بتاتے کہ ہیثمی نے کون سی ''رسوا کن بدعملی'' چھپالی؟۔ ہم نے پوری روایت نقل کی ہے۔ آپ نے دیکھ لیا اس میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے، جسے ''رسوا کن بداعمالیوں'' کا نام دیا جائے؛ مگر حسن صاحب کی کارستانی اور خیانت یقیناً ''رسوا کن'' ہے، بشرطے کہ حیا ہو۔

ذرا کارستانی دیکھیے! خود یہ حرکت کی کہ روایت میں حضرت معاویہؓ کا ایک جملہ جو صاف صراحت کرتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد انھوں نے کسی نامناسب مشروب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اور ان کو سوائے دودھ کے کوئی چیز اب مرغوب نہیں ہے، حسن فرحان صاحب نے روایت کا وہ حصہ صاف اڑا دیا۔ اور یہ اشارہ تک نہیں کیا کہ انھوں نے روایت نامکمل نقل کی ہے اور اس کا کچھ حصہ جان بوجھ کر حذف کیا ہے۔

حسن فرحان صاحب نے ثابت کردیا ہے کہ وہ بے شرمی کی ہر حد سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ روایت کا یہ حصہ ان کی تلبیس اور دجل وفریب کو واضح کردیتا ہے۔ حیرت ہے! کہاں سے حسن فرحان صاحب ڈھٹائی اور بے شرمی کی اتنی مقدار لاتے ہیں کہ خود ہی روایت کا وہ حصہ غائب کرتے ہیں جو ان کے بیان کیے گئے مفہوم اور لگائی گئی جھوٹی تہمت کی تردید وتکذیب کرتا ہے۔ اور الزام لگاتے ہیں

حافظ ابن حجر ہیثمی پر!!

اس الزام کے جھوٹے ہونے پر یہ تو اسی حدیث اور اسی عبارت کی صراحت تھی۔ اب اس سے ذرا آگے مزید سوچیے!

کیا حضرت بریدہ نے بھی شراب پی ہوگی:

روایت میں تو یہ ہے کہ وہ مشروب حضرت بریدہ کو دیا گیا۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لیا اور روایت میں کہیں نہیں کہ انھوں نے اس کو واپس کر دیا اور نہیں پیا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت بریدہ نے نہیں پیا اور واپس کر دیا تو کم از کم یہ تو یقینی ہے کہ ان کو بھی شراب پیش کی گئی۔ یہ حضرت بریدہ نہایت مخلص مجاہد صحابی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کے دوران اسلام لائے اور بیعت فرمائی۔ صلح حدیبیہ، بیعت رضوان وغیرہ تمام موقعوں پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد فرمایا۔ غزوۂ خیبر میں ان کے جہادی کارناموں کی شہرت ہوگئی، تو اس سے خوف آتا تھا کہ یہ شہرت اللہ کے یہاں مواخذے کا سبب نہ بن جائے۔ آخر دم تک اس سے ڈرتے رہے۔ عراق کے جہاد میں گئے، وہیں حضرت عمر کے منصوبے کے مطابق بصرے میں مقیم ہوگئے اور علم ودین کی اشاعت میں مصروف رہے۔ پھر خراسان میں جہاد کے لیے گئے۔ حضرت معاویہؓ نے خراسان میں مرو کا اسلامی عظیم مرکز بنایا تو یہ ان صحابہ میں تھے جن کو تابعین نے مملکت خراسان میں علم دین کے مرجع کی حیثیت سے تسلیم کیا۔

اب سوچیے! حضرت بریدہ کی دینی غیرت کو کیا ہوا تھا کہ کسی شرابی کے پاس گئے تھے؟ اور اگر چلے بھی گئے تھے تو کیا ایسی عظمت وتقویٰ کے حامل صحابی شراب کی محفل میں (معاذ اللہ) پوری بے حیائی سے تشریف فرما رہے ہوں گے؟ نہ زبان سے نکیر نہ عمل سے برا ءت؟ شیعہ حضرات تو صاف یہی مانتے ہیں کہ تمام صحابہ (سوائے چار پانچ کے) اسلام کے دشمن اور بدترین منافق تھے۔ ان کے لیے تو سب ممکن ہے، مگر کوئی غیر شیعہ ایسی باتیں کہے یا سوچے تو اس کی عقل قابل افسوس ہے۔

پھر سیدنا علی کے خانوادے کا کیا حال ماننا پڑے گا؟

حضرت معاویہؓ کے پاس آنے جانے والوں اور ان کی مجلسوں میں شریک ہونے والوں میں ایک نام حبر الامّۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی ہے۔ یہ سیدنا علیؓ کے دست راست، حامی اور نائب تھے۔ صحیح بخاری کی روایات میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت معاویہؓ کی تعریفیں کرتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد کو حضرت معاویہؓ کی کسی علمی رائے پر اعتراض ہوا تو حضرت ابن عباس نے

شاگرد کو سمجھاتے ہوئے حضرت معاویہؓ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہا:

دعه فإنه قد صحب رسول الله صلى الله عليه وسلم.

ان کو کچھ نہ کہو وہ ''صحابیِ رسول'' ہیں۔

نیز یہ بھی کہا کہ ''وہ بڑے عالم'' ہیں۔ کیا حضرت ابن عباسؓ کسی شرابی کو ''صحابی رسول'' اور ''بڑے عالم'' ہونے کی سند دیتے تھے۔

پھر حضرت حسنؓ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ انھوں نے، زبردست فوجی طاقت ہوتے ہوئے، بھی مسلمانوں کی امامت وقیادت اور ان کے دینی معاملات اور دنیوی امور کسی شرابی کے حوالے کردیے؟ کیا یہ دین سے بدترین بے وفائی نہیں ہے؟؟ یقیناً اس کے بعد تو حضرت حسنؓ کا ایمان اور اللہ کے دین سے وفاداری بھی مخدوش ہوجاتی ہے۔

سچ ہے شیعیت ایسی ہی گمراہ فکر ہے کہ اس کو اگر قبول کرلیا جائے تو یقیناً قطعی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ حضرت علی کے صاحب زادگان حسن وحسین اور ابن عباس.....رضی اللہ عنہم وغیرہ نہ دین کے مخلص تھے نہ اللہ ورسول کے وفادار۔

------*------*------

معروف ومشہور شیعہ عالم شیخ علی عاملی کی خیانت:

عصر حاضر میں شیعوں کے ایک نہایت بڑے عالم ومصنف شیخ علی کورانی عاملی ہوئے ہیں۔ یہ بزرگ موجودہ شیعہ دنیا کے بہت بڑے عالم تھے، لبنان کے تھے۔ ''آیت اللہ سیستانی'' اور دیگر بڑے مراجع تقلید کے نمائندے تھے۔ شیعی مذہب میں ان کے بلند علمی مرتبے کی وجہ سے انقلاب کے بعد ایرانی حکومت نے ان کو ایران بلایا۔ وہ شیعیت کے سب سے بڑے علمی مرکز قم میں قیام پذیر ہوئے اور بڑے سرکاری علمی اداروں اور تحقیقی پروجیکٹس کے ذمے دار بنائے گئے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اپنی کتاب ''جواہر التاریخ'' کی دوسری جلد جو خاص طور پر گویا حضرت معاویہؓ کے لیے (شیعی نقطۂ نظر کے مطابق) وقف ہے، انھوں نے دو جگہ (صفحہ ۶۴ اور ۲۶۰) یہ روایت ذکر کی ہے۔ اور وہ تمام خیانتیں اور تلبیسیں کی ہیں جو حسن فرحان صاحب نے کی ہیں۔

ان کے علاوہ ایک اور لفظی تحریف یہ کی کہ:

فَشَرِبَ مُعَاوِيَةُ، ثُمَّ نَاوَلَ أَبِي ثُمَّ قَالَ: مَا شَرِبْتُهُ مُنْذُ حَرَّمَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ.

اس جملے میں ثُمَّ قَالَ کو فقَالَ کر دیا۔ عربی داں سمجھ سکتے ہیں کہ اس طرح حضرت معاویہؓ کے جملے کو حضرت بریدہ کا جملہ بنا دینا آسان ہو گیا۔(۶)

ان صاحب نے مسند احمد کے علاوہ اس روایت کے لیے تاریخ دمشق لابن عساکر (27 /127)، سیر الاعلام: 5 /52 اور مجمع الزوائد: 5 /42 کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ان تمام کتابوں میں ثُمَّ قَالَ ہی ہے۔ کہیں فقَالَ نہیں ہے۔ یعنی ان صاحب نے چار چار جگہ صحیح عبارت دیکھی، پھر بھی تحریف کر کے ہی لکھی۔

ان لوگوں کے تمام اعتراضات اسی طرح جھوٹ، تحریف اور حقائق کو مسخ کر کے ہی قائم کیے جاتے ہیں۔(۷)

افسوس! کہ ہم کو صحابۂ کرامؓ کے بارے میں کس قدر نامعقول قسم کی باتوں کا جواب دینا پڑ رہا ہے؛ مگر ایک بات اچھی ہے کہ اس سے یہ ضرور پتہ چل رہا ہے کہ شیعی ذہن کو صحابہ پر الزام لگانے کے لیے کس قدر بے حیا قسم کی تحریف کرنی پڑتی ہے اور حضرت معاویہؓ کی کردار کشی کے لیے کس طرح کی کارستانیوں پر اترنا پڑتا ہے۔

شیعیت کی تائید اور صحابۂ کرام پر طعن ولعن کی روایات کی جب بھی کوئی عالم تحقیق کرتا ہے پاتا ہے کہ سب کی سب موضوع ومنکر ہیں، ان کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ قرآن کے بیانات، حدیث وسنت حقائق اور صحابہ وتابعین کے عمل کے یقینی وقطعی شواہد ان کو باطل ٹھیراتے ہیں۔ جیسا کہ ناظرین کرام نے ابھی اس کی ایک مثال دیکھی۔ حسن فرحان صاحب کی تمام تحریروں کا بالکل یہی حال ہے۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ.

* * *

حواشی:

(۱) تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے ایک اور نوجوان فارغ مدرسہ نے مجھے یہ بھی لکھا کہ یہ موصوف اس موضوع کے سب سے بڑے محقق ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت صحابۂ کرام سے بدظن کرنے؛ بلکہ پورے مسلک اہل سنت سے بدظن وبے اعتماد کرنے کی کیسی فضا قائم ہے اور سادہ لوح نوجوان کس قدر دھوکوں میں ہیں۔ اور کس قدر ضرورت ہے کہ مدلل اور سنجیدہ گفتگوؤں اور تحریروں کے ذریعہ نوجوانوں کو سنبھالا جائے۔

(۲) http://wwwalmaliky.org/subject.php?id=1525.

(۳) اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس میں کسی حرام مشروب یعنی شراب کا ذکر چل نکلا۔ جس پر حضرت معاویہؓ نے کہا کہ الحمدللہ جب سے ''اُس'' کو حرام قرار دیا ہے، میں نے ''اُس'' کو نہیں پیا۔

(۴) امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے اپنی مصنّف (30560) میں اس کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

مَا شَيْءٌ كُنْتُ أَسْتَلِذُّهُ وَأَنَا شَابٌّ فَآخُذُهُ الْيَوْمَ إِلَّا اللَّبَنَ، فَإِنِّي آخُذُهُ كَمَا كُنْتُ آخُذُهُ قَبْلَ الْيَوْمِ وَالْحَدِيثَ الْحَسَنَ.

پہلے جو چیزیں اچھی لگتی تھیں اب ان میں سے صرف دودھ ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ ابھی بھی حسب سابق لیتا ہوں اور اچھی گفتگو سننے میں بہت لطف آتا ہے۔

(۵) واضح رہے کہ شیعہ علماء اہل سنت کو جن الفاظ سے یاد کرتے ہیں ان میں ''العامۃ'' کا لفظ بھی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو وہ ''الخاصۃ'' کہتے ہیں۔ شیعی لٹریچر پڑھنے والے سب ہی اس سے واقف ہیں۔

(۶) اس تحریف شدہ جملے "فَشَرِبَ مُعَاوِيَةُ ثُمَّ نَاوَلَ أَبِي فقَالَ" کا عربی کی رو سے دو طرح ترجمہ کیا جاسکتا ہے؛ ایک تو بالکل پہلے جیسا ہی (یعنی: تو معاویہؓ نے پیا، پھر انھوں نے وہ مشروب میرے والد صاحب کو دیا پھر کہا: جب سے وہ حرام ہوئی ہے میں نے اس کو نہیں پیا)۔ اس صورت میں یہ حضرت معاویہ کا جملہ رہتا ہے۔ اور اس کا ترجمہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے: تو معاویہ نے پیا، پھر میرے والد کو دیا تو انھوں نے کہا)۔ اس میں یہ امکان پیدا ہو جاتا کہ اسے حضرت بریدہ کا جملہ سمجھا جائے۔

(۷) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو اسلامی تاریخ کے فرقوں اور جماعتوں کا نہایت وسیع تجربہ اور واقفیت تھی، اس تجربہ و واقفیت کی بنا پر فرماتے ہیں کہ تمام فرقوں میں روافض سے زیادہ جھوٹ بولنے والی قوم نہیں (مجموع الفتاویٰ: ۲۶۳/۱۳)۔ منہاج السنۃ النبویۃ (1 / 59) میں تحریر فرماتے ہیں:

قَدِ اتَّفَقَ أَهْلُ الْعِلْمِ بِالنَّقْلِ، وَالرِّوَايَةِ، وَالإِسْنَادِ عَلَى أَنَّ الرَّافِضَةَ أَكْذَبُ الطَّوَائِفِ.

(پوری اسلامی تاریخ میں) حدیث و رجال کے علماء کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ روافض تمام گروہوں میں سب سے بڑے جھوٹے ہیں۔

* * *

علم وقلم اور امت کی فکری تعمیر

از: ڈاکٹر مفتی سہیل ندوی

انسانی تہذیب کی پوری تاریخ پر اگر غیر جانب دارانہ نگاہ ڈالی جائے تو ایک حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ دنیا میں وہی قومیں سربلند رہیں جنہوں نے علم کو اپنا سرمایہ، قلم کو اپنا ہتھیار اور اخلاق کو اپنی شناخت بنایا۔ طاقت کی سلطنتیں چند صدیوں میں بکھر گئیں، دولت کے انبار وقت کی گرد میں گم ہو گئے؛ لیکن علم کی روشنی کبھی بجھ نہ سکی۔ سقراط کا فلسفہ، ارسطو کی منطق، امام غزالی کی حکمت، ابن خلدون کی عُمرانی بصیرت، شاہ ولی اللہ دہلوی کی اصلاحی فکر اور علامہ اقبال کا پیغام آج بھی زندہ ہے؛ کیونکہ علم کی عمر افراد سے کہیں زیادہ طویل ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن مجید نے نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا: ''کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟'' اس مختصر سوال میں پوری انسانی تاریخ کا خلاصہ پوشیدہ ہے کہ عزت، قیادت اور ترقی کا اصل معیار علم ہے، نہ کہ نسب، دولت یا اقتدار۔

اسلام کا آغاز ہی قلم اور علم کے اعلان سے ہوا۔ دنیا کے کسی مذہب یا تہذیب نے اپنی پہلی دعوت کا آغاز علم سے نہیں کیا؛ مگر قرآنِ مجید کی پہلی وحی ''اقرأ'' سے شروع ہوتی ہے۔ گویا اسلام نے سب سے پہلے انسان کے ذہن کو بیدار کیا، اس کی فکر کو روشن کیا اور اسے بتایا کہ جہالت غلامی ہے؛ جب کہ علم آزادی کا دوسرا نام ہے۔ یہ محض ایک مذہبی حکم نہیں؛ بلکہ پوری انسانی تہذیب کے لیے ایک ابدی منشور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کو صرف عبادت گاہ نہیں بنایا؛ بلکہ اسے ایک عظیم علمی مرکز میں تبدیل کر دیا، جہاں قرآن کی تعلیم بھی تھی، حکمت کی مجلسیں بھی تھیں، معاشرتی تربیت بھی تھی اور ریاستی منصوبہ بندی بھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب مسلمان قرآن کے اس پیغام سے وابستہ رہے تو بغداد، قرطبہ، دمشق، قاہرہ، سمرقند، بخارا، دہلی اور لکھنؤ جیسے شہر علم وتحقیق کے عالمی مراکز بن گئے۔ یورپ اس وقت تاریکی

میں ڈوبا ہوا تھا؛ جب کہ مسلم دنیا کی لائبریریاں لاکھوں کتابوں سے مزین تھیں۔ اندلس کی جامعہ قرطبہ، جامعہ زیتونہ، جامعہ ازہر اور نظامیہ بغداد صرف درسگاہیں نہیں تھیں؛ بلکہ تہذیب ساز ادارے تھے، جہاں فلسفہ، طب، فلکیات، ریاضی، ادب، فقہ، حدیث اور زبان و بیان کے علوم یکجا پڑھائے جاتے تھے۔ مسلمان عالم جب کسی مسئلے پر قلم اٹھاتا تھا تو اس کی تحریر صرف اپنے زمانے کے لیے نہیں؛ بلکہ آنے والی صدیوں کے لیے رہنمائی کا سرمایہ بن جاتی تھی۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ آج امتِ مسلمہ کی بڑی تعداد نے علم کے بجائے معلومات کو علم سمجھ لیا ہے۔ سوشل میڈیا کی چند سطریں، مختصر ویڈیوز اور سطحی مباحث نے مطالعے کی عادت کو کمزور کر دیا ہے۔ کتاب سے تعلق کمزور ہوتا جا رہا ہے؛ جب کہ تحقیق، تنقید اور تجزیہ کی روایت بھی محدود ہوتی جا رہی ہے؛ حالانکہ علم کا تعلق صرف معلومات جمع کرنے سے نہیں؛ بلکہ حقیقت تک پہنچنے، دلائل کا جائزہ لینے اور صحیح و غلط میں امتیاز پیدا کرنے سے ہے۔ ایک پڑھی ہوئی کتاب انسان کو صرف معلومات نہیں دیتی؛ بلکہ اس کی شخصیت، اس کی زبان، اس کی سوچ اور اس کے کردار کو بھی سنوارتی ہے۔

ادیب اور مفکر دراصل قوم کی اجتماعی عقل ہوتے ہیں۔ جب معاشرے میں قلم خاموش ہو جائے تو تلواریں بولنے لگتی ہیں، جب تحقیق ختم ہو جائے تو تعصب جنم لیتا ہے اور جب کتابوں سے رشتہ ٹوٹ جائے تو افواہیں علم کی جگہ لے لیتی ہیں؛ اسی لیے ہر دور کے مصلحین نے سب سے پہلے فکری اصلاح کی دعوت دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن کو عوام تک پہنچایا، سرسید احمد خاں نے جدید تعلیم کی ضرورت پر زور دیا، علامہ شبلی نعمانی نے تحقیق کی نئی راہیں کھولیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے صحافت کو علمی وقار عطا کیا، اور علامہ اقبال نے نوجوانوں کو شاہین کی پرواز عطا کی۔ ان تمام شخصیات کا مشترکہ سرمایہ قلم تھا، اور یہی قلم قوموں کی تقدیر بدلنے کا ذریعہ بنا۔

آج ہماری سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ ہم دوبارہ کتاب سے رشتہ جوڑیں، مطالعے کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنائیں، تحقیق کی روایت کو زندہ کریں، اور نوجوان نسل کو یہ احساس دلائیں کہ قوموں کی تعمیر صرف عمارتوں سے نہیں؛ بلکہ کتابوں سے ہوتی ہے، صرف معیشت سے نہیں؛ بلکہ فکر سے ہوتی ہے، اور صرف نعروں سے نہیں؛ بلکہ علم، کردار اور مسلسل محنت سے ہوتی ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر امتِ مسلمہ دوبارہ علمی قیادت حاصل کر سکتی ہے، اور یہی صدائے حق کا حقیقی پیغام بھی ہے۔

علم ہی وہ بنیاد ہے جس پر قوموں کی تہذیب، قیادت اور بقا کی عمارت استوار ہوتی ہے؛ لیکن یہ سوال اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ اگر اسلام نے علم کو اپنی پہلی دعوت بنایا تھا، اگر مسلمانوں نے ایک

ہزار برس تک دنیا کی علمی قیادت کی تھی، اگر بغداد، قرطبہ، بخارا، سمرقند، دہلی اور لکھنؤ جیسے شہر دنیا کے عظیم علمی مراکز تھے، تو پھر ایسا کیا ہوا کہ یہی امت رفتہ رفتہ فکری پسماندگی، علمی جمود اور تہذیبی انحطاط کا شکار ہوتی چلی گئی؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا محض ماضی پر نوحہ خوانی نہیں؛ بلکہ مستقبل کی تعمیر کے لیے ناگزیر شرط ہے۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی بھی قوم کا زوال اچانک نہیں آتا؛ بلکہ اس کی ابتدا فکر کے انحراف سے ہوتی ہے۔ جب مطالعہ کم ہو جائے، تحقیق کا ذوق ختم ہو جائے، سوال اٹھانے کی جرأت باقی نہ رہے، اجتہادی فکر جمود کا شکار ہو جائے اور علم محض امتحانات اور ملازمتوں تک محدود ہو جائے، تو معاشرہ رفتہ رفتہ اپنی تخلیقی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں قومیں دوسروں کی ایجاد کردہ تہذیب کی صارف تو بن جاتی ہیں؛ لیکن خود نئی فکر، نئی تحقیق اور نئی قیادت پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب المقدمہ میں بڑی بصیرت کے ساتھ لکھا ہے کہ قوموں کا عروج صرف معاشی قوت سے نہیں؛ بلکہ علمی وفکری قوت سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب فکر زندہ رہتی ہے تو تہذیب بھی زندہ رہتی ہے، اور جب فکر مر جاتی ہے تو محلات، سلطنتیں اور وسائل بھی قوم کو بچا نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید بار بار انسان کو غور وفکر، تدبر، تعقل اور مشاہدے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کا اسلوب محض احکام سنانے کا نہیں؛ بلکہ عقل کو بیدار کرنے کا ہے۔ کہیں فرمایا: کیا تم غور نہیں کرتے؟ کہیں ارشاد ہوا: کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ اور کہیں انسان کو زمین وآسمان کے نظام میں تدبر کی دعوت دی گئی۔ گویا اسلام نے تقلیدِ جامد کے بجائے شعوری ایمان اور زندہ فکر کی بنیاد رکھی۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں تعلیم کو بھی رفتہ رفتہ ایک تجارتی سرگرمی بنا دیا گیا۔ کامیابی کا معیار صرف ڈگری، ملازمت اور تنخواہ قرار پایا؛ جب کہ کردار، تحقیق، مطالعہ، تخلیق اور سماجی خدمت جیسے عناصر پس منظر میں چلے گئے۔ طلبہ کی بڑی تعداد نصاب ختم کر لیتی ہے؛ لیکن کتاب سے محبت پیدا نہیں ہوتی؛ امتحان پاس کر لیتی ہے؛ لیکن سوال کرنے کی عادت پیدا نہیں ہوتی؛ سند حاصل کر لیتی ہے؛ لیکن معاشرے کے مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ معلومات میں اضافہ ضرور ہوتا ہے؛ مگر حکمت اور بصیرت کا چراغ روشن نہیں ہو پاتا۔

آج کی ڈیجیٹل دنیا نے اس بحران کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ سوشل میڈیا کے اس دور میں معلومات تک رسائی پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو چکی ہے؛ لیکن اس کے ساتھ سطحیت، عجلت اور غیر مصدقہ معلومات کا سیلاب بھی آ گیا ہے۔ چند سیکنڈ کی ویڈیو کو تحقیق سمجھ لیا گیا ہے، چند جذباتی

جملوں کو علم کا متبادل تصور کیا جانے لگا ہے، اور علمی اختلاف کی جگہ شور وغوغا نے لے لی ہے؛ حالانکہ علمی روایت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر دعوے کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھا جائے، ہر خبر کی تحقیق کی جائے، ہر رائے کو احترام کے ساتھ سنا جائے، اور اختلاف کو دشمنی نہیں؛ بلکہ فکری ارتقا کا ذریعہ سمجھا جائے۔

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امتِ مسلمہ کا علمی سرمایہ آج بھی دنیا کے کسی بھی مذہب یا تہذیب سے کم نہیں۔ لاکھوں مخطوطات دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں، ہزاروں علمی کتابیں آج بھی تحقیق کا سرمایہ ہیں اور قرآن وحدیث کی صورت میں ایسا مستند علمی ذخیرہ موجود ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو اس عظیم ورثے سے جوڑا جائے، اسے جدید تقاضوں کے مطابق تحقیق کا سلیقہ سکھایا جائے اور اسے یہ اعتماد دیا جائے کہ اسلام اور جدید علوم میں کوئی تصادم نہیں؛ بلکہ صحیح علم ہمیشہ انسان کو اللہ کی معرفت، انسانیت کی خدمت اور کائنات کی بہتر تفہیم کی طرف لے جاتا ہے۔

اس مقصد کے لیے ہمارے تعلیمی اداروں، مدارس، جامعات، لائبریریوں اور ادبی انجمنوں کو نئے جذبے کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ صرف نصابی تعلیم کافی نہیں؛ مطالعہ، مباحثہ، تحقیق، تصنیف، تنقیدی فکر اور تخلیقی اظہار کو بھی فروغ دینا ہوگا۔ جس دن ہمارے نوجوان کتاب کو اپنا دوست، قلم کو اپنا ساتھی اور تحقیق کو اپنا شوق بنالیں گے، اسی دن علمی بیداری کی نئی صبح طلوع ہوگی۔

یہی وہ علمی انقلاب ہے جس کی بنیاد پر ایک بار پھر ایسے مفکر، محقق، سائنس دان، ادیب، مفسر، محدث اور مصلح پیدا ہو سکتے ہیں جو نہ صرف اپنی قوم؛ بلکہ پوری انسانیت کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمان علم کے ساتھ وابستہ ہوئے تو دنیا نے ان سے سیکھا اور جب انہوں نے علم سے بے اعتنائی اختیار کی تو وہ دوسروں کے محتاج بن گئے؛ اس لیے آج کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ ہم اپنی فکری آزادی، علمی خود اعتمادی اور تحقیقی روایت کو دوبارہ زندہ کریں؛ کیونکہ یہی امت کے روشن مستقبل کی حقیقی ضمانت ہے۔

کتاب، لائبریری اور مطالعے کی ثقافت — ایک مہذب معاشرے کی پہچان

انسانی تہذیب کی تاریخ میں اگر کسی ایک ایجاد نے نسلوں کی تقدیر بدلی ہے تو وہ کتاب ہے۔ کتاب محض چند اوراق کا مجموعہ نہیں؛ بلکہ صدیوں کے تجربات، علوم، افکار، تہذیبوں اور تمدنوں کا امین ہوتی ہے۔ ایک کتاب اپنے مصنف کی زندگی کے تجربات کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرتی ہے، اس کے احساسات کو دوام بخشتی ہے اور اس کے افکار کو زمان ومکان کی حدود سے آزاد کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو معاشرے کتاب سے محبت کرتے ہیں، وہ علم پیدا کرتے ہیں اور جو کتاب سے بے رغبتی

اختیار کرتے ہیں، وہ دوسروں کے علم کے محتاج بن جاتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کی بنیاد ہی کتاب پر رکھی گئی ہے۔ قرآنِ کریم خود اپنے آپ کو ''الکتاب'' کہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری ہدایت ایک محفوظ کتاب کی صورت میں نازل فرمائی۔ گویا اسلام نے کتاب کو محض علم کا ذریعہ نہیں؛ بلکہ ہدایت، تہذیب اور انسان سازی کا محور قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے دورِ مبارک میں وحی کے نزول کے ساتھ ہی کتابت کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا۔ صحابۂ کرامؓ میں ایسے کاتبینِ وحی موجود تھے جو ہر نازل ہونے والی آیت کو فوراً قلم بند کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی پہلی صدی ہی سے تحریر، تدوین اور کتابت کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔

بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے اس روایت کو ایسی وسعت عطا کی کہ دنیا حیران رہ گئی۔ بغداد میں ''بیت الحکمہ'' قائم ہوا، جہاں دنیا کی مختلف زبانوں سے علوم وفنون کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ قرطبہ کی لائبریری میں لاکھوں کتابیں موجود تھیں، جب کہ اس زمانے میں یورپ کے اکثر بادشاہوں کے ذاتی کتب خانوں میں چند سو کتابیں بھی مشکل سے ہوتی تھیں۔ قاہرہ، دمشق، بخارا، سمرقند، نیشاپور، دہلی اور لکھنؤ کی لائبریریاں صرف کتابوں کے ذخیرے نہیں تھیں؛ بلکہ وہ علمی تحریکوں، تحقیقی مباحث اور تہذیبی ارتقا کے مراکز تھیں۔ ان اداروں سے ایسے علماء، محدثین، فقہاء، ادباء، مؤرخین اور سائنس دان پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ پوری انسانیت کے فکری سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں لائبریریوں کی رونق پہلے جیسی نہیں رہی۔ نئی نسل کا ایک بڑا حصہ کتابوں کی بجائے اسکرینوں سے وابستہ ہوگیا ہے۔ اگرچہ ڈیجیٹل ذرائع علم کے حصول میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں؛ لیکن ان کی افادیت اس وقت تک محدود رہتی ہے؛ جب تک ان کے ساتھ سنجیدہ مطالعہ، تنقیدی فکر اور مسلسل تحقیق کا ذوق موجود نہ ہو۔ سوشل میڈیا کی تیز رفتار دنیا نے انسان کو معلومات تو فراہم کی ہیں؛ لیکن مطالعے کی وہ یکسوئی، گہرائی اور فکری پختگی نہیں دی جو ایک اچھی کتاب عطا کرتی ہے۔ کتاب انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے، سوال پیدا کرتی ہے، دلیل تلاش کرنا سکھاتی ہے، اور مختلف زاویوں سے حقیقت کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

مطالعہ دراصل شخصیت سازی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ ایک اچھا قاری کبھی سطحی انسان نہیں ہوتا؛ کیونکہ کتاب اس کے ذہن کو وسعت دیتی ہے، زبان کو شائستگی عطا کرتی ہے، استدلال کو مضبوط بناتی ہے اور اس کے اندر برداشت اور مکالمے کا سلیقہ پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے مفکرین، مصلحین، سائنس دانوں اور ادباء کی زندگیوں میں مطالعہ بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ علامہ

اقبال، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اکابر کی شخصیتوں کے پیچھے برسوں کا مسلسل مطالعہ، غور وفکر اور علمی ریاضت کارفرما تھی۔ ان کی تحریروں میں جو گہرائی، وسعت اور تاثیر نظر آتی ہے، وہ اتفاقاً پیدا نہیں ہوئی؛ بلکہ کتابوں سے دیرینہ رفاقت کا نتیجہ تھی۔

بدقسمتی سے ہمارے تعلیمی نظام میں بھی مطالعے کی ثقافت کمزور ہوتی جارہی ہے۔ طلبہ کی دلچسپی اکثر نصابی کتابوں تک محدود رہتی ہے؛ جب کہ نصاب سے باہر کے مطالعے کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے؛ حالانکہ حقیقی تعلیم وہی ہے جو نصاب کی حدود سے آگے بڑھ کر انسان کو خود سیکھنے، خود سوچنے اور خود تحقیق کرنے کا سلیقہ عطا کرے۔ اگر کسی تعلیمی ادارے میں جدید عمارتیں، جدید آلات اور اعلیٰ نصاب تو موجود ہوں؛ لیکن وہاں فعال لائبریریاں، مطالعاتی حلقے، ادبی نشستیں اور تحقیقی ماحول نہ ہو، تو اس ادارے سے معلومات رکھنے والے افراد تو نکل سکتے ہیں؛ لیکن مفکر اور محقق پیدا نہیں ہوسکتے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے گھروں میں بھی کتاب کو وہی مقام دیا جائے جو ماضی میں دیا جاتا تھا۔ والدین اگر بچوں کو ابتدائی عمر ہی سے مطالعے کا ذوق دیں، ہر ماہ چند اچھی کتابیں گھر لائیں، گھریلو لائبریری قائم کریں اور بچوں کے ساتھ کتابوں پر گفتگو کریں تو نئی نسل کی فکری بنیاد مضبوط ہوسکتی ہے۔ اسی طرح مدارس، اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں مطالعہ گھنٹہ، کتاب بینی کی تحریک، تبصرۂ کتب، مصنّفین سے ملاقات اور علمی مذاکرے جیسی سرگرمیوں کو فروغ دیا جانا چاہیے، تاکہ کتاب دوبارہ معاشرتی زندگی کا فعال حصہ بن سکے۔

آج امتِ مسلمہ کے سامنے سب سے بڑا چیلنج صرف معاشی یا سیاسی نہیں؛ بلکہ فکری ہے اور اس فکری بحران کا علاج کتاب ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ جب نوجوان کتاب سے دوستی کریں گے، لائبریریوں کو آباد کریں گے، تحقیق کو اپنی عادت بنائیں گے اور قلم کو اپنی شناخت بنائیں گے، تو یقیناً ایک نئی علمی بیداری جنم لے گی۔ یہی وہ بیداری ہے جو افراد کو دانشور، معاشروں کو مہذب اور قوموں کو باوقار بناتی ہے۔ کتابیں خاموش ہوتی ہیں؛ مگر انہی کی خاموشی سے تاریخ کے بڑے بڑے انقلابات جنم لیتے ہیں۔

قلم کی امانت، اہلِ علم کی ذمہ داریاں اور مستقبل کی فکری قیادت

اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو علم عطا کرتا ہے تو درحقیقت اسے ایک عظیم امانت بھی سونپ دیتا ہے۔ یہ امانت صرف معلومات محفوظ رکھنے کا نام نہیں؛ بلکہ حق کی ترجمانی، معاشرے کی رہنمائی، فکری انحراف کی اصلاح اور آنے والی نسلوں کے لیے علم وحکمت کا سرمایہ چھوڑ جانے کی ذمہ داری بھی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے اہلِ علم کا ذکر غیر معمولی احترام کے ساتھ کیا ہے اور انھیں حق کی گواہی دینے

والوں میں شمار کیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم، ادیب، محقق اور قلم کار صرف ایک فرد نہیں؛ بلکہ پوری قوم کے فکری ضمیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قلم کی تاریخ دراصل ذمہ داری کی تاریخ ہے۔قلم سے لکھی گئی ایک سطر دلوں میں امید بھی پیدا کرسکتی ہے اور مایوسی بھی؛ قوموں کو جوڑ بھی سکتی ہے اور تقسیم بھی؛ تعمیر بھی کرسکتی ہے اور تخریب بھی؛ اسی لیے اسلام نے زبان اور قلم دونوں کو جواب دہی کے دائرے میں رکھا ہے۔انسان جو کچھ بولتا ہے اور جو کچھ لکھتا ہے، وہ محض دنیا کے لیے نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی اس کا حساب ہوگا۔یہی احساسِ جواب دہی قلم کو دیانت، توازن اور انصاف عطا کرتا ہے۔

آج کا دور ابلاغ کا دور ہے۔پہلے ایک مصنف کی تحریر ہزاروں افراد تک پہنچتی تھی؛ مگر آج ایک مختصر تحریر یا ایک پیغام چند لمحوں میں لاکھوں انسانوں تک پہنچ جاتا ہے۔اس غیر معمولی وسعت نے قلم کی ذمہ داری کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دیا ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اسی سہولت نے غیر ذمہ دارانہ اظہار، افواہوں، کردار کشی، تعصب، مذہبی منافرت اور جھوٹے پروپیگنڈے کو بھی فروغ دیا ہے۔بہت سے لوگ تحقیق کے بغیر خبریں پھیلاتے ہیں، دلائل کے بغیر فتوے صادر کرتے ہیں اور اختلافِ رائے کو ذاتی دشمنی میں تبدیل کر دیتے ہیں؛ حالانکہ علمی دنیا کی بنیاد دلیل، دیانت اور تحمل پر قائم ہوتی ہے، نہ کہ جذباتی نعروں اور غیر مصدقہ اطلاعات پر۔

ایک حقیقی قلم کار وہ ہوتا ہے جو لکھنے سے پہلے پڑھتا ہے، رائے قائم کرنے سے پہلے تحقیق کرتا ہے، اختلاف سے پہلے انصاف کرتا ہے اور تنقید سے پہلے اپنے ضمیر کا محاسبہ کرتا ہے۔اس کی تحریر میں جذبات ضرور ہوتے ہیں؛ لیکن جذبات پر دلیل کی حکمرانی ہوتی ہے۔اس کے الفاظ میں قوت ضرور ہوتی ہے؛ مگر وہ قوت تہذیب اور شائستگی کے دائرے سے باہر نہیں نکلتی۔یہی وہ اوصاف ہیں جنہوں نے اسلامی علمی روایت کو دنیا کی معتبر ترین علمی روایات میں شامل کیا۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ امت کے بڑے علماء اور ادباء نے کبھی قلم کو ذاتی شہرت یا وقتی مفاد کا ذریعہ نہیں بنایا۔امام بخاریؒ نے حدیث کی تدوین کے لیے ہزاروں میل کا سفر کیا، ہر روایت کی تحقیق کی، ہر راوی کی زندگی کا جائزہ لیا، تب جا کر اپنی شہرہ آفاق کتاب مرتب کی۔امام طبریؒ نے تاریخ لکھتے وقت مختلف روایات جمع کیں، ان کا تقابلی مطالعہ کیا اور دیانت کے ساتھ انھیں محفوظ کیا۔علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرت، تاریخ اور ادب پر قلم اٹھایا تو ہر سطر تحقیق کا نمونہ بن گئی۔سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی کو جس علمی معیار پر مکمل کیا، وہ آج بھی تحقیق کا ایک روشن نمونہ ہے۔یہ سب شخصیات ہمیں سکھاتی ہیں کہ قلم کی اصل طاقت اس کی علمی دیانت میں پوشیدہ ہے، نہ کہ اس کی

شہرت یا مقبولیت میں۔

موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ کو صرف خطباء اور مقررین ہی نہیں؛ بلکہ ایسے مصنّفین، محققین، مترجمین، مفکرین اور صحافیوں کی ضرورت ہے جو اسلام کی حقیقی تعلیمات کو عصرِ حاضر کی زبان میں پیش کرسکیں۔ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ مصنوعی ذہانت، حیاتیاتی علوم، ماحولیات، عالمی سیاست، معاشی نظام، ابلاغیات اور سماجی تبدیلیوں نے نئے سوالات پیدا کیے ہیں۔ اگر اہلِ علم ان موضوعات پر قرآن وسنت کی روشنی میں سنجیدہ، متوازن اور تحقیقی رہنمائی فراہم نہیں کریں گے تو فکری خلا کو دوسروں کے نظریات پُر کریں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ ادبی رسائل، تحقیقی جرائد اور علمی مجلّات کی اہمیت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔ تعمیرِ حیات، صدائے حق اور اس نوعیت کے دیگر علمی وادبی رسائل محض مضامین کی اشاعت کا ذریعہ نہیں؛ بلکہ فکری تربیت، علمی مکالمے، ادبی ذوق اور قومی شعور کی آبیاری کا مؤثر پلیٹ فارم ہیں۔ یہ رسائل نوجوان قلم کاروں کی تربیت کرتے ہیں، سنجیدہ مباحث کو فروغ دیتے ہیں، زبان وادب کی حفاظت کرتے ہیں اور معاشرے میں علمی وقار کو زندہ رکھتے ہیں۔ اگر ایسے رسائل کی سرپرستی کی جائے، ان کے مطالعے کو فروغ دیا جائے اور نوجوان نسل کو ان سے وابستہ کیا جائے تو یقیناً ایک نئی فکری بیداری پیدا ہوسکتی ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر صاحبِ علم اپنے آپ سے یہ سوال کرے کہ اس نے اپنے علم کو معاشرے کے لیے کس حد تک مفید بنایا؟ اس کی تحریروں نے کتنے ذہنوں کو روشنی دی؟ اس کے قلم نے کتنے شبہات کا ازالہ کیا؟ اس کی تصنیفات نے کتنے نوجوانوں میں مطالعے کا شوق پیدا کیا؟ اگر ہمارا قلم انسانوں کو اللہ سے قریب کرے، اخلاق کو مضبوط کرے، علم کو فروغ دے، محبت اور اخوت کو عام کرے، اور معاشرے میں خیر واصلاح کی فضا پیدا کرے، تو یہی قلم ہمارے لیے صدقۂ جاریہ بن جائے گا اور یہی وہ میراث ہوگی جو ہماری زندگی کے بعد بھی آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

علمی احیاء کا لائحۂ عمل اور امت کا روشن مستقبل

امتوں کی زندگی میں بعض ادوار ایسے آتے ہیں جب انھیں اپنی تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنے حال کا بھی بے لاگ احتساب کرنا پڑتا ہے۔ یہ احتساب مایوسی پیدا کرنے کے لیے نہیں؛ بلکہ نئی زندگی، نئی قوت اور نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے ہوتا ہے۔ امتِ مسلمہ بھی آج ایسے ہی ایک تاریخی موڑ پر کھڑی ہے۔ ایک طرف اس کے پاس قرآنِ کریم جیسی ابدی کتاب، سنتِ نبوی ﷺ جیسا کامل نمونہ، چودہ صدیوں پر محیط علمی سرمایہ، عظیم فقہی، تفسیری، حدیثی، فلسفیانہ اور ادبی ورثہ موجود

ہے، اور دوسری طرف علمی جمود، تحقیقی کمزوری، فکری انتشار، تہذیبی مرعوبیت اور تعلیمی پسماندگی جیسے چیلنجز بھی اس کے سامنے ہیں۔ ان حالات میں سب سے بڑا سوال یہ نہیں کہ ہماری مشکلات کیا ہیں؛ بلکہ یہ ہے کہ ان مشکلات سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب نہ تو ماضی کی اندھی تقلید میں پوشیدہ ہے اور نہ مغرب کی غیر مشروط نقالی میں، بلکہ اس کا حل اس متوازن فکر میں ہے جو قرآن وسنت کی دائمی تعلیمات کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ جوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اسلامی تہذیب کی اصل قوت ہمیشہ اس کی اجتہادی بصیرت رہی ہے۔ ہمارے اسلاف نے ہر دور کے نئے مسائل کو قرآن وسنت کی روشنی میں سمجھا، ان پر غور کیا، تحقیق کی اور امت کی رہنمائی کی۔ یہی علمی جرأت، یہی تحقیقی دیانت اور یہی فکری وسعت آج بھی ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔

علمی احیاء کا پہلا مرحلہ فرد کی اصلاح ہے۔ ہر طالب علم، ہر استاد، ہر عالم، ہر قلم کار اور ہر والدین کو اپنے اندر مطالعے کی عادت پیدا کرنی ہوگی۔ روزانہ کچھ وقت کتاب کے لیے مخصوص کرنا، تحقیق کی عادت ڈالنا، مختلف نقطۂ نظر کا مطالعہ کرنا، اختلاف کو برداشت کرنا اور دلیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنا ایک مہذب معاشرے کی بنیادی علامتیں ہیں۔ جو قومیں کتاب سے اپنا رشتہ مضبوط رکھتی ہیں، وہ کبھی فکری غلام نہیں بنتیں۔ ان کے فیصلے جذبات کی بجائے شعور کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور ان کی ترقی عارضی نہیں؛ بلکہ پائیدار ہوتی ہے۔

دوسرا مرحلہ تعلیمی اداروں کی اصلاح ہے۔ مدارس، اسکول، کالج اور جامعات صرف امتحانات لینے اور اسناد تقسیم کرنے کے مراکز نہ ہوں؛ بلکہ تحقیق، تخلیق، مکالمہ اور شخصیت سازی کے مراکز بنیں۔ طلبہ کو محض نصاب یاد کرانے کے بجائے سوال کرنے، سوچنے، لکھنے، تقریر کرنے، تنقیدی جائزہ لینے اور تحقیق کرنے کی تربیت دی جائے۔ لائبریریاں ہر تعلیمی ادارے کا سب سے فعال حصہ ہوں، جہاں کتابیں صرف الماریوں کی زینت نہ بنیں؛ بلکہ طلبہ کے ہاتھوں میں نظر آئیں۔ علمی سیمینار، ادبی نشستیں، مطالعاتی حلقے، کتابوں پر تبصرے اور تحقیقی مقابلے تعلیمی ماحول کا مستقل حصہ بنائے جائیں۔

تیسرا مرحلہ خاندانی ماحول کی اصلاح ہے۔ بچے کی پہلی درس گاہ اس کا گھر ہوتا ہے۔ اگر گھر میں کتاب کا احترام ہوگا، والدین خود مطالعہ کریں گے، بچوں کو اچھی کتابیں تحفے میں دیں گے، علمی گفتگو کریں گے اور سوالات کی حوصلہ افزائی کریں گے، تو یہی بچے آگے چل کر تحقیق اور تخلیق کے میدان میں نمایاں کردار ادا کریں گے؛ لیکن اگر گھر کا ماحول صرف تفریح، موبائل اور غیر ضروری مصروفیات تک محدود ہو جائے تو پھر تعلیمی ادارے بھی اپنی پوری ذمہ داری ادا نہیں کر سکیں گے۔

اسی طرح علماء، ادباء، صحافیوں اور دانشوروں کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ان کی تحریریں صرف وقتی جذبات کی ترجمان نہ ہوں؛ بلکہ امت کی فکری رہنمائی کا ذریعہ بنیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ نوجوان نسل کے سوالات کو سمجھیں، ان کی زبان میں گفتگو کریں، جدید علوم سے واقفیت حاصل کریں اور اسلام کی آفاقی تعلیمات کو ایسی علمی اور متوازن زبان میں پیش کریں جو عقل کو مطمئن اور دل کو منور کرے۔ آج دنیا دلیل سنتی ہے، تحقیق کو قبول کرتی ہے اور علمی گفتگو کا احترام کرتی ہے؛ اس لیے امت کی دعوت بھی علم، حکمت اور حسنِ استدلال کے ساتھ پیش ہونی چاہیے۔

یہاں ایک اور حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ زبانیں بھی تہذیبوں کی محافظ ہوتی ہیں۔ اردو زبان نے گزشتہ دو صدیوں میں اسلامی فکر، دینی علوم، ادبی سرمایہ، صحافت اور تہذیبی شعور کی جس طرح خدمت کی ہے، وہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔ لہٰذا اردو کے علمی و ادبی رسائل، تحقیقی جرائد اور فکری مجلّات کی سرپرستی دراصل ایک پوری تہذیبی روایت کی حفاظت ہے۔

آج جب دنیا تیزی سے مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل ابلاغ اور سائنسی ترقی کے نئے دور میں داخل ہو رہی ہے، تو مسلمانوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ بھی ہے اور موقع بھی۔ اگر ہم اپنے علمی ورثے کو جدید تحقیق کے ساتھ ہم آہنگ کریں، اپنے نوجوانوں کو قرآن کے پیغام، سنتِ نبوی ﷺ کے اخلاق، جدید سائنس کی بصیرت اور تحقیق کی روشنی سے آراستہ کریں، تو مستقبل یقیناً ہمارا ہو سکتا ہے۔ قوموں کی تقدیر وسائل سے زیادہ افکار بدلتے ہیں، اور افکار کو بدلنے کا ذریعہ ہمیشہ قلم رہا ہے۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ امتِ مسلمہ کا حقیقی احیاء نہ صرف سیاسی نعروں سے ہوگا، نہ محض جذباتی خطابت سے اور نہ وقتی جوش و خروش سے؛ بلکہ اس کا راستہ علم، تحقیق، کردار، دیانت، مطالعہ، مکالمہ اور مسلسل محنت سے ہو کر گزرتا ہے۔ جب ہمارے گھروں میں کتاب کی خوشبو ہوگی، ہمارے مدارس اور جامعات میں تحقیق کی روشنی ہوگی، ہمارے قلم میں اخلاص ہوگا، ہماری زبان میں اعتدال ہوگا اور ہماری فکر میں قرآن و سنت کی رہنمائی ہوگی، تب ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جو صرف اپنے لیے نہیں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لیے خیر، عدل، امن اور علم کا پیامبر ہوگا۔

یہی صدائے حق کا حقیقی پیغام ہے، یہی اس کی فکری دعوت ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جو امتِ مسلمہ کو ایک مرتبہ پھر علمی قیادت، تہذیبی وقار اور اخلاقی عظمت کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ.

* * *

جدید انسان کا المیہ

از: مولانا محمد اسلام حقانی
نائب مدیر ماہنامہ الحق جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

''ہم نے کائنات کو مسخر کرلیا، ستاروں تک رسائی حاصل کر لی، مادیت کی چمک سے باہر اجالا کر دیا؛ مگر اپنے باطن کے اندھیروں میں آج بھی بھٹک رہے ہیں، جب انسان کے پاس سب کچھ ہے تو پھر سکون کیوں نہیں؟ یہی جدید انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔''

مادیت کی چمک دمک، سائنسی فتوحات اور ٹیکنالوجی کے لامتناہی سیلاب نے آج کے انسان کو کائنات کا سکندر تو بنا دیا ہے؛ لیکن اس چکا چوند نے اس کے اندر کے چراغ گل کر دیے ہیں، جدیدیت کا یہ دور دراصل ایک ایسا چمکدار سراب ہے جہاں انسان مادی عروج کی بلند ترین چوٹی پر کھڑا ہو کر بھی اپنے باطن کے تاریک ترین غاروں میں بھٹک رہا ہے، وہ خلاؤں کو تسخیر کر چکا ہے، زمین کے سینے کو چاک کر کے خزانے نکال چکا ہے اور انٹرنیٹ کی لہروں پر پوری دنیا کو مٹھی میں بند کر چکا ہے؛ لیکن اس ہمہ جہت مادی ترقی کی قیمت اسے اپنی روح کا سودا کر کے چکانی پڑی ہے۔

جدید انسان ایک ایسا زخم خوردہ اور پیاسا مسافر ہے جو ہجوم کی سڑکوں پر تنہا، ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں بے چین اور سرمایے کے انبار پر بیٹھ کر بھی سکونِ قلب کی خیرات مانگ رہا ہے، اس کا المیہ یہ نہیں کہ اس کے پاس ذرائع نہیں ہیں؛ بلکہ اس کا اصل المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد اور کائنات کے حقیقی مرکز سے کٹ چکا ہے، جس کے نتیجے میں وہ ایک ایسے ابدی اضطراب اور وجودی بحران کا شکار ہو گیا ہے جس کا علاج کسی مادی سائنس و ٹیکنالوجی کے پاس نہیں۔

جدید انسان صرف وہ نہیں ہے جو اکیسویں صدی کے مادی ماحول میں سانس لے رہا ہے؛ بلکہ یہ ایک مخصوص فکری، نفسیاتی اور وجودی کیفیت کا نام ہے، روایتی انسان کے برعکس جدید انسان وہ وجود ہے جس نے عقلِ سلیم، وجدان اور وحی الٰہی کی نور سے منہ موڑ کر صرف اور صرف عقلِ محض،

منطق اور مادی مشاہدے کو اپنا معبود اور الہ بنالیا ہے، یہ وہ انسان ہے جو کائنات کے اصل مرکز یعنی ذاتِ خداوندی سے دور ہوکر وجود کے حاشیے پر کھڑا ہے اور ہر چیز کو صرف ظاہری اور سطحی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، اس کے اندر یہ مادی اور سائنسی تکبر پیدا ہوگیا ہے کہ وہ خود کو زمین پر خدا کی جگہ دیکھنا چاہتا ہے، جو فطرت کو مسخر کرنے اور اپنے نفس کی مرضی کے مطابق قوانین بنانے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ ایک ایسا یک جہت اور یک رخا انسان ہے جس کا علم اب کیفیتی نہیں رہا؛ بلکہ کمیتی اور حجم پر مبنی ہوگیا ہے، وہ اشیاء کے خواص اور ان کے مادی فوائد سے تو بخوبی واقف ہے؛ لیکن ان کی حقیقی ماہیت، معنویت اور تقدس سے بالکل بے خبر ہو چکا ہے، وہ اپنے بارے میں اتنا کم علم رکھتا ہے کہ پرانے زمانوں کا کوئی قبائلی طبیب بھی انسانی فطرت کے گہرے باطنی رویوں کو اس سے بہتر سمجھتا تھا۔

اس جدید انسان کا ارتقاء تاریخ میں اچانک نہیں ہوا؛ بلکہ یہ تاریخ کے چند بڑے فکری اور سماجی انقلابات کا تلخ نتیجہ ہے، اس کا آغاز اس دور سے ہوا جس نے مابعد الطبیعات کے بجائے انسان کو کائنات کا مرکز قرار دے دیا، اس کے بعد آنے والے زمانوں نے عقلِ انسانی کو ہر چیز کا حتمی فیصلہ کن قرار دے کر ذہن اور مادے کو ایک دوسرے سے جدا کردیا، صنعتی انقلاب نے انسان کو فطرت کے روایتی اور پرسکون ماحول سے کاٹ کر مشینوں کی بے رحم دنیا میں دھکیل دیا، جہاں وہ خود ایک پرزہ بن کر رہ گیا، بالآخر جب دنیا سے خدا اور مابعد الطبیعات کے اخراج کا علامتی اعلان کردیا گیا تو جدید انسان مکمل طور پر ایک ایسے اخلاقی اور روحانی خلا میں لاوارث ہوگیا، جہاں نہ کوئی مستقل حقیقت تھی اور نہ ہی کوئی ابدی سہارا، اس آزادی نے اسے کائنات میں اکیلا اور بے سہارا کردیا اور اب وہ اس تنہائی اور ابدی لایعنیت سے گھبرا کر دوبارہ کسی نہ کسی مادی غلامی یا کارپوریٹ کلچر کی اندھی تقلید کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔

جدیدیت اور مادی ترقی کے اس غلبے نے انسانی ذات کے اندر ایک ہولناک فکری اور نفسیاتی تغیر پیدا کردیا، روایتی انسان کا طرزِ عمل ظاہر سے باطن کی طرف سفر کرتا تھا اور وہ کائنات کی ہر مادی چیز میں خدا کے مرکز اور اس کی ذات کا جلوہ دیکھتا تھا؛ لیکن جدید انسان کے ظاہر اور باطن میں ایک مستقل خلیج پیدا ہوگئی ہے، زندگی کے تمام شعبوں (خواہ وہ سیاست ہو، معیشت ہو، فنِ تعمیر ہو یا تعلیم) سے مقدس عنصر کو یکسر نکال باہر کیا گیا اور انہیں صرف اور صرف مادی فائدے، افادیت اور صارفیت تک محدود کردیا گیا، میڈیا اور اشتہارات کے نظام نے انسان کے اندر لامتناہی مصنوعی ضروریات پیدا کردی ہیں، جنہیں پورا کرنے کے لیے وہ دن رات ایک مشینی دوڑ میں لگا رہتا ہے، انسان جو پہلے

فطرت کا حصہ تھا اور اس کا احترام کرتا تھا، اب ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر اس نے فطرت کا بے دردی سے استحصال شروع کر دیا، جس نے نہ صرف بیرونی ماحول کو آلودہ کیا؛ بلکہ خود اس کے باطنی وجود کی پاکیزگی کو بھی ملیامیٹ کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ جدید انسان تمام تر آسائشوں کے باوجود مستقل اضطراب اور بے چینی کا شکار رہتا ہے، اس اضطراب کی سب سے بڑی وجہ وہ گہری بیگانگی ہے جس نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، وہ اپنے کام سے، اپنی بنائی ہوئی مصنوعات سے، اپنے معاشرے سے اور بالآخر خود اپنی اصل ذات سے بیگانہ ہو چکا ہے، وہ لاکھوں کے ہجوم میں رہ کر بھی تنہائی کے ہولناک احساس سے لرزتا ہے، زندگی سے مابعد الطبیعات کے اخراج نے اس کے اندر معنویت کا ایک ایسا بھیانک خلا پیدا کر دیا ہے، جسے دنیا کی کوئی مادی لذت نہیں بھر سکتی، وہ صبح سے شام تک ایک مشین کی طرح مادی دوڑ میں دوڑتا ہے؛ لیکن اندر سے وہ اس سوال کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے کہ اس لامتناہی دوڑ کا حتمی مقصد کیا ہے؟ جدید سرمایہ دارانہ نظام نے انسان کی نفسیات کو کچھ ہونے یا اپنی روح کو نکھارنے کے بجائے، مادی اشیاء کو اپنے قبضے میں رکھنے پر لگا دیا ہے، جدید انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی قدر کا اندازہ اس بات سے لگاتا ہے کہ اس کے پاس کیا کچھ ہے، نہ کہ اس بات سے کہ وہ خود بطور انسان کیا ہے؟ ٹیکنالوجی نے وقت بچانے کے ہزاروں آلات تو بنا دیے؛ لیکن جدید انسان کے پاس خود اپنے وجود کے باطن میں جھانکنے کے لیے وقت ختم ہو گیا، وہ ایک ایسی سیال جدیدیت میں جی رہا ہے جہاں عقائد، نظریات، اخلاقیات اور رشتوں میں کچھ بھی مستقل نہیں رہا اور اس مستقل غیر یقینی صورت حال نے اس کے اعصاب کو شل اور روح کو بیمار کر دیا ہے۔

آج کا یہ جدید انسان بیک وقت کئی تباہ کن بحرانوں کی زد میں ہے، اس کا سب سے پہلا اور بڑا بحران روحانی اور فکری ہے؛ اس نے اپنی عقل کے تکبر میں روحِ مطلق سے ناتا توڑ لیا ہے اور چونکہ وہ روح کے وجود کا انکار کرتا ہے، اس لیے وہ سچے روحانی تجربات سے محروم ہو کر خود کو جھوٹی لذتوں، فیشن کے تماشوں، منشیات اور نفسانی ہیجانات کے جہنم میں جھونک رہا ہے، اس کے نتیجے میں ایک ہولناک نفسیاتی بحران نے جنم لیا ہے، جہاں ڈپریشن اور تنہائی موجودہ دور کی وبائیں بن چکی ہیں، جدید علمِ نفسیات انسان کو ایک مادی حیوان یا بائیولوجیکل مشین کے طور پر دیکھتا ہے، اس لیے وہ انسان کے اصل باطنی درد کا علاج کرنے میں مکمل ناکام رہا ہے، الغرض! خاندانی نظام کا بکھر جانا، رشتوں کا مادی مفادات کے تابع ہو جانا اور اخلاقیات کا نسبتی ہو جانا اس کا سماجی اور شناخت کا بحران ہے، جہاں

خیر اور شر کی تمیز ہی مٹتی جارہی ہے، یہاں تک کہ جو ماحولیاتی بحران ہم باہر زمین پر گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی آلودگی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں، وہ دراصل جدید انسان کے اپنے اندرونی نفس کی آلودگی کا ہی عکس ہے، جو کائنات پر خدا بن کر حکومت کرنے کی خواہش کا نتیجہ ہے۔

حاصل یہ کہ جدید انسان آج ایک ایسی بند گلی کے آخری سرے پر کھڑا ہے جہاں مادی ترقی اپنے عروج پر ہے؛ مگر باطنی سکون کا نام ونشان بھی مفقود ہے، اس نے باہر کی دنیا کو تو مسخر کرلیا، ستاروں کی گزرگاہوں کو ڈھونڈ لیا اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرلیا؛ لیکن وہ اپنے اندر کے نفس کو مسخر کرنے اور اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے میں بری طرح ناکام رہا، اس ہمہ جہت وجودی بحران، ذہنی خلفشار اور روح کی تڑپ سے نکلنے کا واحد راستہ اب یہی بچا ہے کہ جدید انسان مغرب کی مرعوبیت اور اللہ تعالیٰ، دین اور فطرت کے خلاف اپنی اس دیرینہ بغاوت کو ختم کرے، مادی مڈھ بھیڑ سے پیدا ہونے والے اپنے فکری بتوں کو توڑے اور اس زندہ الٰہی روایت، حکمت اور عرفان کی طرف واپس لوٹ جائے جو اسے دوبارہ اس کے اصل مرکز یعنی ذاتِ خداوندی سے جوڑ کر اسے حقیقی اطمینان، ابدی سکون اور زندگی کے سچے معنی عطا کرسکتی ہے۔

* * *

نئی کتابیں

(۱)

نام کتاب : کمیشن اور بروکری کے احکام
مرتب : مفتی احمد اللہ نثار قاسمی، ناظم دارالعلوم رشیدیہ، حیدرآباد
اشاعت : ۲۰۲۳ء تعداد صفحات : ۳۴۵
ناشر : دارالعلوم رشیدیہ، مہدی پٹنم حیدرآباد
رابطہ نمبر : 8341658711
تعارف نگار : ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

==========

انسانی معاشرہ باہمی تعاون اور لین دین کے مضبوط رشتوں پر استوار ہے۔ دنیا کا کوئی فرد اپنی زندگی کی تمام ضروریات اور ان کے حصول کے تمام وسائل اپنے اندر سمیٹ نہیں سکتا، اس لیے ہر شخص کسی نہ کسی مرحلے پر دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے۔ یہی احتیاج معاملات، تجارت اور باہمی تبادلے کی بنیاد بنتی ہے۔ بہت سے مواقع پر خریدار اور فروخت کنندہ ایک دوسرے تک براہِ راست رسائی نہیں رکھتے؛ چنانچہ ان کے درمیان ایک ایسا واسطہ وجود میں آتا ہے جو دونوں کو قریب لانے، اعتماد کی فضا قائم کرنے اور معاملہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اصولی طور پر یہ خدمت باہمی تعاون اور خیر خواہی کے جذبے پر مبنی ہونی چاہیے؛ تاہم موجودہ معاشی نظام میں یہی واسطہ ایک مستقل پیشے کی صورت اختیار کر چکا ہے، جسے عرفِ عام میں کمیشن اور بروکری کہا جاتا ہے۔

قدیم فقہی لٹریچر میں ایسے واسطہ کے لیے ''سمسار'' اور ''دلال'' جیسی اصطلاحات مستعمل رہی ہیں اور اس کی اجرت کو ''سمسرہ'' اور ''دلالی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فقہائے اسلام نے متعین شرائط کے ساتھ اس خدمت پر اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک فقہی صورت ''جعالہ'' کی بھی ہے، جس میں کسی متعین خدمت یا گم شدہ چیز کی بازیابی پر انعام مقرر کیا جاتا ہے۔ ان دونوں ابواب کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامی نے معاملات کے اس شعبے کو نظر انداز نہیں کیا؛ بلکہ

اس کے صحیح اور غلط دونوں پہلوؤں کی واضح رہنمائی فرمائی ہے۔

عصرِ حاضر میں مقامی، قومی اور بین الاقوامی تجارت کا دائرہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ کمیشن ایجنٹ اور بروکر کے بغیر بے شمار تجارتی معاملات کی تکمیل دشوار محسوس ہوتی ہے۔ مویشی منڈی میں یہی شخص ''دلال'' کہلاتا ہے، سبزی منڈی میں ''آڑھتی''، اسٹاک ایکسچینج میں ''بروکر'' اور جائیداد کی خرید وفروخت میں ''پراپرٹی ڈیلر''؛ لیکن اس میدان میں جہاں جائز صورتیں موجود ہیں، وہیں ناجائز اور ممنوع طریقے بھی بڑی تیزی سے فروغ پا رہے ہیں، جس کے باعث اس موضوع کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''جمعیت علماء ہند'' کے فقہی اجتماعات اور مختلف علمی سیمیناروں میں بھی کمیشن کی متعدد صورتوں پر تفصیلی بحثیں ہوئیں اور ان کے متعلق اہم تجاویز منظور کی گئیں۔

زیرِ نظر کتاب ''کمیشن اور بروکری کے احکام'' اسی اہم موضوع پر ایک نہایت وقیع اور جامع کاوش ہے، جسے فاضل مرتب مفتی احمد اللہ نثار قاسمی نقشبندی دامت برکاتہ نے نہایت محنت، تتبع اور فقہی بصیرت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ موصوف کی تحریر کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے، اسے علمی جامعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جس سے قاری کو مسئلے کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

مرتب نے کتاب کو نو ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں کمیشن کے بنیادی تصورات اور متعلقہ اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں سرکاری امور سے متعلق کمیشن کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں مختلف کمپنیوں میں رائج کمیشن کی صورتوں کا فقہی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں کمپنیوں کے ملازمین کے لیے کمیشن لینے کی شرعی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ پانچواں باب خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹروں اور طبی مراکز میں رائج کمیشن کے نظام کا جائزہ لیتا ہے، جہاں مریضوں کو مختلف لیبارٹریوں، اسپتالوں اور تشخیصی مراکز کی طرف بھیجنے کے عوض کمیشن لینے اور دینے کی مروجہ صورتوں کا مدلل محاسبہ کیا گیا ہے، جو بلاشبہ اس کتاب کا نہایت اہم اور فکر انگیز باب ہے۔

چھٹے باب میں کمیٹیوں اور چٹ فنڈ کی مختلف صورتوں کا شرعی جائزہ لیا گیا ہے اور ان میں پائے جانے والے سودی پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے، نیز جائز و ناجائز صورتوں کے درمیان امتیاز بھی قائم کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں رقم کی منتقلی پر حاصل ہونے والے کمیشن کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ آٹھویں باب میں مدارس، مساجد اور دینی اداروں میں کمیشن کے لین دین کی مختلف شکلوں کا جائزہ

پیش کیا گیا ہے، جبکہ نواں باب متفرق مسائل پر مشتمل ہے، جس میں متعدد نئے اور عملی سوالات کے مدلل جوابات فراہم کیے گئے ہیں۔

آج کمیشن اور بروکری سے وابستہ افراد کی ایک بڑی تعداد شرعی احکام سے ناواقف ہے، جس کے نتیجے میں لاعلمی یا سہل انگاری کے باعث بہت سے معاملات ناجائز صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں یہ کتاب نہ صرف اہلِ تجارت، بروکرز اور کمیشن ایجنٹس کے لیے راہنما ہے؛ بلکہ مفتیانِ کرام، طلبہ علومِ دینیہ اور اسلامی معاشیات کے طالب علموں کے لیے بھی ایک نہایت مفید علمی سرمایہ ہے۔

مجھے اس کتاب کے مطالعے کا موقع ملا۔ اس کی علمی افادیت، فقہی استدلال، حسنِ ترتیب اور عمدہ طباعت نے خوشگوار تاثر چھوڑا۔ توقع ہے کہ اہلِ علم اور اربابِ تجارت اس سے بھرپور استفادہ کریں گے اور یہ کتاب اپنے موضوع میں ایک معتبر اور قابلِ اعتماد مرجع کی حیثیت اختیار کرے گی۔ اللہ تعالیٰ مرتبِ کتاب کی اس علمی خدمت کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اسے ان کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے اور امتِ مسلمہ کو اس سے نفعِ عام عطا فرمائے۔ آمین۔

==========

(۲)

نام کتاب : مسلم لڑکیوں کا ارتداد: اسباب وحل

مرتب : حضرت مولانا مفتی احمد اللہ نثار قاسمی، ناظم دارالعلوم رشیدیہ، حیدرآباد

اشاعت : ۲۰۲۳ء تعداد صفحات : ۴۰۰

ناشر : دارالعلوم رشیدیہ، مہدی پٹنم حیدرآباد

رابطہ نمبر : 8341658711

تعارف نگار : ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

==========

دنیا کی تمام نعمتوں میں سب سے عظیم اور بے بہا نعمت ایمان ہے۔ یہی وہ دولت ہے جس کے تحفظ کے لیے اہلِ ایمان نے ہر دور میں اپنی جانیں نچھاور کیں، اپنے مال واسباب کو قربان کیا، اہل و عیال کی جدائی برداشت کی اور ہر طرح کی آزمائشوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا؛ لیکن ایمان کی حفاظت پر کوئی سمجھوتا گوارا نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ میں ایمان کی سلامتی

کو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا گیا ہے۔ افسوس کہ موجودہ دور میں مادی ترقی، فکری انتشار اور تہذیبی یلغار نے مسلمانوں کے اندر ایمان کی قدر و قیمت کا احساس کمزور کر دیا ہے۔ عقیدۂ توحید کی حفاظت، شعائرِ اسلام کی پاسداری اور اسلامی تشخص کی بقا کی فکر رفتہ رفتہ ماند پڑتی جارہی ہے۔ صورتِ حال یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بعض مسلمان لاعلمی، بے احتیاطی یا مداہنت کے نتیجے میں غیر اسلامی رسوم و شعائر میں شرکت کو بھی معمولی بات سمجھنے لگے ہیں؛ حالانکہ اسلام اپنے ماننے والوں کو توحید کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھنے اور ہر قسم کے شرکیہ مظاہر سے مکمل اجتناب کا حکم دیتا ہے۔

مزید تشویش ناک حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں نوجوان نسل، بالخصوص مسلم لڑکے اور لڑکیاں، مختلف فکری، سماجی اور تہذیبی عوامل کے زیرِ اثر اپنے دین و ایمان سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ مخلوط تعلیمی نظام، اخلاقی بے راہ روی، موبائل فون اور انٹرنیٹ کا بے لگام استعمال، دینی تعلیم و تربیت سے محرومی، غربت، جہالت، مخلوط ماحول میں ملازمت، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، عیسائی مشنریوں اور دیگر گمراہ کن تحریکوں کی سرگرمیاں، نیز فرقہ پرستانہ اور مشرکانہ ماحول نے اس خطرے کو کہیں زیادہ سنگین بنا دیا ہے۔ ایسے نازک حالات میں ہر صاحبِ ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ایمانی سلامتی کی فکر کرے؛ بلکہ اپنی اولاد اور آنے والی نسلوں کے عقائد و اخلاق کی حفاظت کے لیے بھی سنجیدہ اور موثر اقدامات کرے۔

اسی شدید احساسِ ذمہ داری اور دینی غیرت کے جذبے کے تحت حضرت مولانا مفتی احمد اللہ نثار قاسمی نقشبندی دامت برکاتہم نے ''مسلم لڑکیوں کا ارتداد: اسباب و حل'' کے عنوان سے یہ نہایت اہم، فکر انگیز اور جامع کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ مؤلف نے اس حساس اور عصرِ حاضر کے نہایت اہم موضوع پر مختلف جہات سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے اسباب، نتائج اور تدارک کو مدلل اور منظّم انداز میں پیش کیا ہے۔

کتاب کے ابتدائی ابواب میں ایمان کی عظمت، اس کی حفاظت کی ضرورت، جذبہ ایمانی کی آبیاری، عقیدۂ توحید کی پاسبانی اور شرک و مداہنت سے اجتناب کی تلقین نہایت موثر انداز میں کی گئی ہے۔ اس کے بعد ارتداد کی سنگینی، اس کے شرعی، اعتقادی اور معاشرتی اثرات اور اس سے متعلق اہم فقہی مسائل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مؤلف نے یہ حقیقت بھی واضح کی ہے کہ بعض اوقات انسان بظاہر عبادات کا اہتمام کرتا رہتا ہے؛ لیکن کفریہ عقائد یا افعال اختیار کر لینے کے سبب ایمان سے محروم ہو جاتا ہے، جو انتہائی تشویش ناک صورتِ حال ہے۔

مزید برآں، کتاب میں حیا، عفت اور عصمت کی اسلامی تعلیمات کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابیات رضی اللہ عنہن کی پاکیزہ سیرتوں سے روشن مثالیں دے کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد پاکدامنی، حجاب اور اخلاقِ حسنہ پر قائم ہے؛ جبکہ بے حیائی اور اخلاقی آزادی کس طرح خاندانی نظام کو تباہ کر دیتی ہے اور نوجوان نسل کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

بین المذاہب نکاح کے شرعی احکام اور اس کے سنگین معاشرتی و دینی نتائج پر بھی مؤلف نے نہایت بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ اسی طرح مسلم لڑکیوں کے ارتداد اور غیر مسلموں سے شادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے متعدد اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور تہذیبی عوامل پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ شادیوں میں بے جا اخراجات، تاخیرِ نکاح، مخلوط تعلیم، مخلوط معاشرت، دینی تربیت کا فقدان، والدین کی غفلت، فلمی اور سوشل میڈیا کا اثر، موبائل اور انٹرنیٹ کا بے محابا استعمال اور دیگر بہت سے اسباب کو مؤلف نے شواہد اور مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مسلم لڑکیوں کے ارتداد سے متعلق متعدد مستند رپورٹس، اخبارات، رسائل اور مختلف ذرائع سے جمع کی گئی معلومات کو یکجا کیا گیا ہے، جس سے قاری کو مسئلے کی سنگینی کا حقیقی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض مسلم دشمن تنظیموں کی سرگرمیوں اور ان کی حکمتِ عملیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے؛ تاکہ مسلمان حالات کا صحیح ادراک کر سکیں۔

کتاب کے آخری ابواب میں اصلاحِ احوال اور عملی رہنمائی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ والدین کی ذمہ داریاں، اولاد کی دینی تربیت، نگرانی، مناسب عمر میں نکاح، اسلامی ماحول کی فراہمی، غیر مخلوط تعلیمی اداروں کا قیام، موبائل اور انٹرنیٹ کے استعمال میں احتیاط، علماء، مدارس اور اہلِ خیر کی ذمہ داریاں، نیز دعا، اصلاحِ نفس اور اجتماعی جدوجہد کی اہمیت کو نہایت حکیمانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یوں یہ کتاب صرف مسئلے کی نشاندہی ہی نہیں کرتی؛ بلکہ اس کے عملی اور قابلِ عمل حل بھی پیش کرتی ہے۔

راقم کے مطالعے میں حضرت مولانا مفتی احمد اللہ نثار قاسمی دامت برکاتہم کی متعدد تصانیف آچکی ہیں، خصوصاً رمضان المبارک سے متعلق معروفات و منکرات پر ان کی گراں قدر کتاب کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا، جس سے یہ تاثر مزید پختہ ہوا کہ مؤلف کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو محض عمومی گفتگو پر اکتفا نہیں کرتے؛ بلکہ متعلقہ مواد کو وسیع پیمانے پر جمع کر کے، ہر پہلو کا باریک بینی سے

جائزہ لیتے ہوئے، نہایت منظّم اور جامع انداز میں پیش کرتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی علمی ذوق، تحقیقی مزاج اور وسعتِ مطالعہ کا روشن نمونہ ہے۔ اس میں علمی استناد، وافر مواد، عمدہ ترتیب اور دل نشیں اسلوبِ بیان یکجا ہو گئے ہیں، جس سے اس کی افادیت اور وقعت مزید بڑھ گئی ہے۔

ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ اس موضوع پر مختلف علاقائی زبانوں، خصوصاً ہندی، رومن انگریزی اور دیگر مقامی زبانوں میں مختصر مگر مؤثر کتابچے بھی تیار کیے جائیں؛ تاکہ معاشرے کے ہر طبقے تک یہ پیغام آسانی سے پہنچ سکے اور نئی نسل کے ایمان وعقیدے کی حفاظت میں یہ کوششیں معاون ثابت ہوں۔

کتابت، طباعت، کاغذ، سرورق اور مجموعی پیشکش کے اعتبار سے بھی یہ کتاب معیاری، دیدہ زیب اور ناشر کے حسنِ ذوق کی آئینہ دار ہے۔ توقع ہے کہ اہلِ علم، ائمہ، خطباء، اساتذہ، والدین اور نوجوان طبقہ اس کتاب کا بھرپور خیر مقدم کرے گا اور یہ تصنیف اپنے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل کرے گی۔ اللہ تعالیٰ مؤلف، ناشر اور اس کی اشاعت وترویج میں شریک تمام حضرات کی مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اس کتاب کو امتِ مسلمہ کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا مؤثر ذریعہ بنائے اور اسے صدقہ جاریہ قرار دے۔ آمین۔

==========

(۳)

نام کتاب : امت کی مجموعی ترقی کا لائحۂ عمل

مصنف : مفتی قیام الدین قاسمی

تبصرہ نگار : محمد رافع ندوی، استاذ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ

ملنے کا پتہ : مکتبہ مشن تقویت امت، ڈمرا سیتامڑھی بہار 843302

رابطہ نمبر : 7070552322

==========

میرے سامنے اس وقت جو کتاب ہے، اس کے مصنف کو اللہ تعالیٰ نے دردمند دل دیا ہے اور وہ تحریر وتصنیف کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں، ان میں ملت کی زبوں حالی کے اسباب کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی ترقی کا لائحۂ عمل پیش کیا گیا ہے۔ تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی تمام مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ متعدد مضامین میں انھوں نے

نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے اور انھیں اصلاحِ معاشرہ کے لیے سرگرم کردار ادا کرنے کی ترغیب دی ہے۔ علماء کو ان کی ذمہ داریاں بھی یاد دلاتے ہیں۔

وہ امت کے بہت سے مسائل کی جڑ کو تعلیمی زوال میں دیکھتے ہیں، اس لیے تعلیم کے فروغ کے لیے نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔

کتاب کی سطر سطر سے جوش، جذبہ، عزم اور ارادہ جھلکتا ہے۔ مصنف کی بے چینی اور امت کی ترقی کے لیے ان کی فکر صاف نظر آتی ہے۔ ان کا اندازِ نگارش بھی بے تکلّفانہ اور محاوراتی ہے۔ انھوں نے اپنی بات کو مثالوں سے خوب مدلل بھی کیا ہے اور قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ سے استشہاد کرتے جاتے ہیں۔

بابِ اول میں امت کی ترقی کا 15 نکاتی فارمولا اور روڈ میپ کے تحت وہ پندرہ نکات پیش کرتے ہیں، جن میں سے ہر نقطہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور حقیقی و واقعی محسوس ہوتا ہے۔ ان میں ایک اہم نقطہ تہجد اور دعاؤں کا اہتمام ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ ساری پلاننگ کر لی؛ مگر جب تک اوپر سے اپروول نہیں ملتا، ہم ذرہ برابر بھی قوم کو نفع نہیں پہنچا سکتے؛ اس لیے اس قابلیت اور مقبولیت کے لیے ہمارا دعا کرنا اور اللہ سے لو لگانا ضروری ہے، خصوصاً تہجد کے وقت۔

بہرحال، کتاب بہت دلچسپ، معقول، مدلل، عملی اور زمینی سچائیوں اور حقیقتوں سے جڑی ہوئی ہے اور اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے بالاستیعاب پڑھا جائے اور ان تجاویز و تدابیر پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

وہ نوجوان جو اپنے ماحول اور معاشرے میں دینی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں، اصلاحِ معاشرہ کا بیڑا اٹھانا چاہتے ہیں، وہ اس کتاب سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس مفید کتاب کے لیے مصنف قابلِ مبارک باد ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبولیت سے سرفراز فرمائے اور ان کو مزید علمی اور عملی کاموں کی توفیق اور ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے آمین۔

* * *